ISSN 0974-7346

نومبر ۲۰۲۵ء

جلد۲۱۲ــــعدد ۱۱

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰؍روپے۔ فی شمارہ ۴۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100
تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دار المصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ جمادی الاول ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۵ء | عدد ۱۱

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

اکتوبر کے مہینے کا آغاز غزہ میں قتل و خونریزی بند کرنے کے اس منصوبے کے اعلان سے ہوا جس کے مطابق اسرائیلی و فلسطینی یرغمالوں کی رہائی، اسرائیلی فوجوں کے مرحلہ وار انخلا اور حماس کو غیر مسلح کیے جانے کی باتیں اور شرطیں ظاہر کی گئیں۔ ساتھ ہی کچھ خدشات بھی ظاہر کیے گئے جو اب یعنی قریب بیس دنوں کے بعد درست بھی نظر آنے لگے ہیں۔ دور جدید میں ظلم، جبر، دہشت، حیوانیت بلکہ مکمل ابلیسیت کا جو منظر غزہ والوں نے دیکھا، حق یہ ہے کہ فلسطین و عرب بلکہ ایشیا اور یورپ کی تاریخ کے حافظے کو کریدنے والوں کی نظر سے انسانیت کی تذلیل کے ایسے مناظر بہت کم گزرے ہوں گے۔ ایسے میں سانسوں کے لیے زندگی کے لمس کے چند غیر یقینی احساسات کچھ امن پسند انسانوں کے لیے غنیمت ہی ٹھہرے۔ لیکن یہ سوال بہرحال اپنی جگہ ہے کہ اس خوں ریزی اور غارت گری کے مجرموں کو انسان ہونے اور انسانی زندگی گزارنے کی مہلت کیوں دی گئی؟ اس سوال کے جواب میں بجز انی اعلم مالا تعلمون پر ایمان و یقین کے اور کوئی وجہ، دل کو بہلانے والی نہیں۔

***

غزہ میں عارضی ہی سہی، جسم و جاں کے چھلنی کیے جانے کا سلسلہ کچھ تو رکا، لیکن نسل پرستی سے پیدا ہونے والی نفرت اور ناکردہ گناہوں سے تیار کی گئی فرد جرم اور اس کے حوالے سے ملک عزیز میں تعصب اور انتقام کی جس کاشت کا عمل جاری ہے اس میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ یکم اکتوبر کی پہلی سرخی میں جہاں غزہ جنگ بندی کے تعلق سے خدشات کا اظہار تھا وہیں صفحہ اول کی دوسری بڑی سرخی میں بہار کے پینسٹھ لاکھ رائے دہندگان کے ناموں کو ہٹانے اور مٹانے کی خبر میں بھی یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اس عمل میں کمزور طبقات بالخصوص اقلیت کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس مہینے کے صرف بیس دنوں کی خبریں دیکھی جائیں تو لداخ، بریلی، سنبھل، گجرات، رشی کیش، کٹک اڑیسہ یعنی پورے ملک میں نفرت، عداوت اور انتقامی جذبوں کی شدت لیے بلاخیز اور بے قابو موجوں کے تھپیڑوں کے سوا کچھ نہیں۔ صدیوں پرانی تہذیب اور تاریخ کی گواہ عمارتوں کا انہدام، کہیں معاشرے کی سربرآوردہ شخصیتوں کو عادی مجرموں کی طرح قید خانوں میں پابند سلاسل کیے جانے کا عمل، کہیں ایس آئی آر کے ذریعہ بے وطن کیے جانے کی تیاری تو دوسری جانب کروروں، غیر موجود رائے دہندگان کے فرضی وجود پر اصرار۔ عجب عالم کہ خرد کا نام جنوں رکھنے اور جنوں کو خرد کہنے پر کرشمہ سازوں کو کوئی شرمندگی نہیں۔

***

شرم تو اسی دن سے آنی بند ہو گئی تھی جب فریق غالب نے آئین کی نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لی تھی۔ آزادی کے معاً بعد ملک کے دونوں حصوں میں جو خون خرابہ ہوا وہ ایک نہایت خونی داستان کا گویا دیباچہ تھا۔ اس وقت کے معارف کے صفحات میں آج بھی اس خونی تراوش کا رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ستمبر اور اکتوبر ۱۹۴۷ء کے شذرات تھے جو مولانا عبد السلام ندوی کے قلم سے نکلے۔ ایک مثالی امن پسند، شاعر طبیعت، ادیب فطرت اور گوشہ گیر مزاج والے مولانا ندوی نے لکھا کہ "کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں قتل وغارت گری و بربادی جو انتہائی سنگ دلی سے ہو رہی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی تک آزادی کی سچی قدر کرنے سے محرومی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو ڈر ہے کہ ملی ہوئی نعمت بھی زائل نہ ہو جائے"۔ یہ تاریخ کے ایک مزاج داں کی دور بینی تھی جس نے دیباچہ پڑھ کر کتاب کے آئندہ مضامین بھانپنے کا اظہار کیا تھا۔ ان الفاظ کو شاید تب فغان درویش سمجھا گیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ وہ فغان درویش تھی جو شاید ہر دور میں کم ہی سنی گئی۔

***

فغان درویش سنی کیا جاتی، نالہ و فریاد کی لے البتہ بڑھتی ہی گئی۔ آزادی کے دس بارہ سال بھی نہیں گزرے کہ دستور و آئین کی قسم کھانے والوں کو اقتدار کی ہوس اور اس راہ میں عدل و انصاف کی ہر منزل سے بے پروا گزر جانے کی روش، اصل منزل سے اس طرح دور کرتی گئی کہ آئین ہی کو بھلا دیا گیا، جو نظر والے تھے، ان کے لیے یہ منظر عجیب سوالیہ نشان تھا کہ غلامی سے آزادی، اخلاق و شرافت سے آزادی میں کیسے بدل گئی۔ اردو زبان، مسلم یونیورسٹی، فرقہ پرستی، اوقاف، توہین رسالت مآبؐ، جامعہ عثمانیہ کی قلب ماہیت، مسلمان بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم، اسپیشل میرج ایکٹ، گاؤ کشی کا بل، اردو نصاب، مردم شماری میں اردو زبان کا اندراج، سہ لسانی فارمولا اور ان سب پر مستزاد منظم فسادات، یہ سارے عنوانات آزاد ہندوستان کی نئی تصنیف کے ان ابواب کے تھے جو کسی اور تزک برہمنی کی خبر دے رہے تھے۔

***

ایسے حالات میں انفرادی احساسات نے جس اجتماعی عمل کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی ان میں ایک دینی تعلیمی کونسل اور دوسری مسلم مجلس مشاورت کا قیام تھا۔ یہ تحریکیں حال سے کہیں زیادہ ہندوستان کے مستقبل کو سنبھالنے اور سنوارنے والی دور بیں اور نہایت مثبت سیاسی دور اندیشی کا مثال بننے کی بلند ترین صلاحیت کی حامل تھیں۔ پہلی تحریک تو جزوی طور پر اس حد تک کامیاب کہی جاسکتی ہے کہ اس نے دینی تعلیم کی بنیادوں کو مضبوطی عطا کی جس سے ستر کی دہائی کے خاتمے تک دین کے قلعوں کو بروقت مدد اور کمک مل گئی۔ مسلم مجلس مشاورت، آزاد اور سیکولر ہندوستان

کی فضامیں غیر سیکولر یا نہایت فرقہ پرست آلودگی سے تحفظ کا سب سے موثر ذریعہ بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ابتدا میں اس دعویٰ کی سچائی کے ثبوت میں ملک بھر میں عوامی جوش وخروش کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ مسلمانوں سے زیادہ ملک کی بدقسمتی رہی کہ مسلم مجلس مشاورت کو ملک کی فکری قیادت کا جو حق تھا، اس کو ادا نہیں کرنے دیا گیا۔ اسباب وعوامل سے اب کیا بحث کی جائے۔ بغداد و اندلس اور فلسطین و شام کی طرح زوال آمادہ ذہنیت سے بربادی کی کارفرمائی کا نوحہ ہی پڑھا جاسکتا ہے۔ سینہ کوبی کی ہمت اب کس میں ہے؟ لیکن ادھر مشاورت کے جسم ناتواں میں زندگی کی کچھ رمق ضرور نظر آنے لگی ہے اور اس کی مثال دستاویزات مشاورت کے نام سے قریب گیارہ سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مجلد دفتر کی اشاعت ہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۲۰۱۵ء تک کے قریب ساٹھ سال میں مسلم مجلس مشاورت کی زندگی جیسی گزری اس کی پوری کہانی اس تاریخی دستاویز میں آگئی ہے۔ دستاویز کیا حقیقتاً یہ وہ اعمال نامہ ہے جو بتاتا ہے کہ قوموں کی زندگی کس طرح جنت اور جہنم کے وعدوں اور وعیدوں کی مستحق بنتی رہتی ہے۔ اس مجموعہ دستاویزات کے مرتب ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں کی زندگی کا اب تک شاید سب سے بڑا کارنامہ ہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے ساٹھ برس کی مدت کی تمام رودادوں، فیصلوں، تجویزوں، قراردادوں، کاوشوں اور صدارتی و افتتاحی خطبوں کو یکجا کرنے میں گویا اک عمر گزار دی۔ دستاویزات مشاورت کی شناخت کی علامت کے طور پر وشاورھم کا حکم مستعار اپنی خوبصورت خطاطی سے کتاب کی روح میں شامل، اخلاص نیت کا اظہار بھی ہے اور کامیابی کے لیے مختصر ترین حرفوں کا جامع ترین اشاریہ بھی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلم مجلس مشاورت ایسے گوشے میں نظر آنے لگی جسے گم نامی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس مجموعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تن ہمہ داغ داغ شد کے باوجود قومی معاملات سے یہ بے حس و بے خبر نہیں رہی۔ آثار قدیمہ کی مساجد کا معاملہ ہو، مہاراشٹر کے فسادزدگان کا مسئلہ ہو، مسلم پرسنل لا، بابری مسجد، ریاستی دہشت گردی وغیرہ مسائل ہوں، مجلس مشاورت اپنے وجود کا احساس دلاتی رہی۔ ایسی اہم، ہمہ گیر، اور ایسی دانش مندانہ تحریک کی کاروائیوں کی سطر سطر واقعی رقعات تاریخ کی طرح محفوظ رکھے جانے کی مستحق ہے۔

ملک اور قوم کا گزر جن حالات سے ہو رہا ہے، ابتدائی سطروں میں اس کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے۔ یہاں کہنا یہی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ کمال درجہ کے فکر مندوں، دانش وروں اور امت کے مخلص ترین ذہنوں کی اس یادگار کو از سر نو متحرک وفعال بنایا جائے۔ امت کے لیے ایک حرف میم ہی کافی ہے۔ یہاں تو تین میم موجود ہیں۔ کارواں کی کامیابی کے لیے کم از کم تین کے عدد کا اشارہ ایسا نہیں کہ نہ سمجھا جاسکے۔

***

مقالات

مریم کی تصویر کشی بائبل اور قرآن مجید میں: موازنہ

پروفیسر عبد الرحیم قدوائی

اعزازی ڈائرکٹر، نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابتدائے اسلام سے اب تک مغربی فضلاء اور مستشرقین کا یہ گویا تکیہ کلام رہا ہے کہ قرآن مجید نعوذ باللہ بائبل سے مستعار بلکہ سرقہ اور اس کا انتہائی ناقص چربہ ہے۔ اس ضمن میں وہ سب سے زیادہ حوالہ قصص الانبیاء کا دیتے ہیں کہ بہر کیف یہ امر واقعہ ہے کہ تقریباً بیس انبیائے کرام کے نام اور کسی حد تک ان سے منسوب واقعات بائبل اور قرآن مجید میں مشترک ہیں۔ اصلاً اس کا سبب بائبل (توریت اور انجیل) اور قرآن مجید کے منبع وحی کا یکساں ہونا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اللہ نے انسان کی ہدایت کے لئے آسمانی کتب اور رسولوں کا نظم قائم کیا۔ حالات کے پیش نظر احکام شریعت الٰہی میں جزوی تبدیلی یقیناً ہوتی رہی لیکن تمام کتب سماویہ بشمول قصص الانبیاء کا پیغام ایک ہی رہا اور بنیادی عقائد ہمیشہ توحید، رسالت اور آخرت کے رائج رہے۔ اسی نکتے کا اطلاق اخلاقیات اور اقدار پر بھی ہوتا ہے۔ عہد خواہ کوئی ہو اخلاقی تعلیمات، طرز زندگی سے متعلق صالح ہدایات الٰہی بجنسہٖ مماثل ہی رہیں۔

مستشرقین کے سرقے کے الزام کو جانچنے کا معروضی اور معروف طریقہ یہی ہے کہ انبیائے کرام اور دیگر شخصیات کے بارے میں بائبل اور قرآن مجید کے بیانیوں کا پہلو بہ پہلو موازنہ اور مطالعہ کیا جائے۔ اس مقالے میں زیر گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم ہیں، تاکہ یہ منقح ہو کہ:

(اً) کیا قرآن مجید کا حضرت مریم (۱۸ ق م-۴۳ء) سے متعلق تذکرہ بائبل کی نقل ہے۔ اگر ہے تو کس حد تک اسے "سرقہ" قرار دیا جاسکتا ہے۔

(ب) یا پھر قرآن مجید کا بیانیہ بائبل سے مختلف ہے اور اس صورت میں اختلاف کی نوعیت اور جہات کیا ہیں؟

(ج) کیا دونوں کے مطالعے سے حضرت مریم کی یکساں شبیہ عیاں ہوتی ہے اور اگر مختلف ہے تو اخلاقی، فنی اور واقعاتی لحاظ سے دونوں میں کیا اور کتنا فرق ہے۔
(د) اس موازنے کی روشنی میں بآسانی یہ امر طے ہو سکتا ہے کہ کیا قرآن مجید کو بائبل سے ماخوذ متصور کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت مریمؑ کا اسم گرامی ستر (۷۰) مقامات پر آیا ہے۔ اہم تر نکتہ یہ ہے کہ سورہ آل عمران اور سورہ مریم میں ان کا جامع و مربوط تذکرہ ہے۔ اس کے بالمقابل بائبل میں ان کا ذکر سرسری طور پر ہے بلکہ ضمناً اور تبعاً کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ہیں جبکہ توجہ تمام تر حضرت عیسیٰؑ کے کمالات اور جلالت شان پر مرکوز ہے۔

ابھی اشارہ صرف ان کے تذکرے کے حجم کا کیا گیا، اصل نکتہ ان کی تصویر کشی کا ہے کہ قارئین پر ان کی شخصیت کا کیا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس کی توضیح اور تشریح کے لئے اولاً بائبل اور پھر قرآن مجید میں ان کی تصویر کشی پر نقد و نظر ہے اور حاصل کلام کے طور پر اس موازنے کے نتائج پیش ہیں۔ اس تجزیے کی روشنی میں قارئین بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کیا واقعۃً قرآن مجید میں حضرت مریم سے متعلق مندرجات بائبل سے مستعار ہیں۔ اولاً حضرت مریم کے بارے میں بائبل کے اقتباسات پیش ہیں:

اس سے قبل یہ صراحت مناسب ہے کہ بائبل سے یہاں مراد عیسائیت سے مختص کتاب انجیل موسوم بہ عہد نامہ جدید (New Testament) ہے۔ یہ مندرجہ ذیل چار راویوں کے بیانیوں پر مشتمل ہے: ۱. متّی (Matthew)، ۲. مرقس (Mark)، ۳. لوقا (Luke) اور ۴. یوحنا (John)۔ اس مجموعے کا مکمل نام یہ ہے: ''انجیل مقدس یعنی ہمارے خداوند اور منجّی [نجات دہندہ] یسوع مسیح کا نیا عہد نامہ''[1]۔ انجیل کے محرّف اور شرک آمیز ہونے کا ثبوت اس کے مکمل عنوان ہی سے آشکار ہے۔

متّی نے مریم کی تصویر کشی یہ کی ہے:

اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ

---

[1] بائبل کے اقتباسات کا مصدر یہ ہے۔ کتاب مقدس بائبل سوسائٹی آف انڈیا، بنگلور، ۲۰۱۵ء

ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اس کے شوہر یوسف نے، جو کہ راست باز تھا اور اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا، اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر یہ کہا: اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لانے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ اس کے بیٹا ہوگا تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا[۲]۔

قرآن مجید کے بیانیے میں مرکزی کردار حضرت مریم ہیں، فرشتے ان سے ہم کلام ہوتے ہیں ان کو عیسیٰؑ کی خرق عادت ولادت سے مطلع کرتے ہیں۔ ابتداء میں وہ استعجاب میں مبتلا ہوتی ہیں اور پھر ایک ہوش مند شخص کی طرح ان سے جرح کرتی ہیں کہ ان کے ہاں ولادت کیسے ممکن ہے کیونکہ ان کو کسی مرد نے نہیں چھوا ہے۔ آخر کار وہ رضائے الٰہی پر قانع ہو جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے ایمان کامل اور عفت وعصمت کی تعریف وتوصیف کی ہے۔

اس کے برعکس بائبل کے مذکورہ بالا اقتباس میں مریم کی حیثیت ناقابل ذکر حد تک ضمنی ہے۔ توجہ تمام تر یوسف نامی شخص پر ہے۔ قارئین پر قدرۃً یوسف کے تقویٰ اور عظمت کا تاثر قائم ہوتا ہے کہ قربانی اور اطاعت الٰہی یوسف کے کردار کے نمایاں پہلو ہیں۔ قرآن مجید کے بالمقابل اس پورے منظر نامے میں مریم سرے سے موجود ہی نہیں۔ فرشتے ان کے مبینہ منگیتر / شوہر سے گفتگو کرتے ہیں اور وہ انتہائی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یوسف نامی اس شخص کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اس واضح اور بنیادی فرق کے پیش نظر کون صاحب عقل وفہم اسے تسلیم کر سکتا ہے کہ قرآن مجید محض بائبل کی نقل ہے۔ یہاں تو مرکزی کردار ہی مختلف ہیں، اصل واقعے کا رخ جدا ہے اور مریم کا کردار بالکل ثانوی ہے۔ قرآن مجید میں مریم کا ذکر خیر ان کی پیدائش سے قبل ہی سے موجود ہے کہ کیسے ان کی پرہیزگار والدہ نے اپنی اولاد کو خدمت الٰہی کے لئے وقف کرنے کی نذر مانی اور مریم کی پیدائش ہونے پر ان کو اللہ کی نذر کر دیا۔ کیسے اللہ نے ان

---

[۲] ماخذ سابق، ص:۵۔ انجیل لوقا میں عیسیٰؑ کی پیدائش کے بیانیے میں فرشتے کی مریم سے گفتگو مذکور ہے، البتہ یہ بھی اس لحاظ سے شنیع اور محرف ہے کہ فرشتے نے عیسیٰؑ کی پیدائش کی انھیں اطلاع دیتے ہوئے یہ اضافہ کیا: ''وہ خدا کا بیٹا کہلائے گا... وہ مولود مقدس خدا کا بیٹا کہلائے گا'' (لوقا ۲۶:۱-۳۶)۔

کی یہ مخلصانہ نذر قبول کی اور مریم کی بہترین پرورش اور پرداخت کا انتظام عبادت گاہ میں اللہ کے رسول زکریاؑ کے سپرد کیا اور عبادت الٰہی میں مشغول مریم کے لئے اللہ کیسے معجزاتی طور پر ایسی نعمتیں نازل کرتا رہا جس پر اللہ کے رسول زکریاؑ کو استعجاب بھی ہوا اور رشک بھی۔ پھر فرشتوں نے حضرت مریم کو بغیر باپ عیسیٰؑ کی ولادت کے منصوبہ الٰہی سے باخبر کیا اور کیسے مریم حمل، دردزہ اور معاندین کے ہتک عزت پر مبنی دل خراش طعنوں اور ملامت کی آزمائشوں سے گزریں اور استعانت الٰہی کی بدولت سرخ رو رہیں کہ اللہ نے وضعِ حمل کے دوران ان کے لئے خورد و نوش کا خصوصی نظم کیا، فرشتوں نے ان کی راہ بینی کی اور پھر نومولود عیسیٰؑ نے گہوارے میں اپنی والدہ ماجدہ کی عفت اور عظمت کی شہادت دی۔ انجیل کے بیانیے میں مریم کی اس رفعت اور تقرب الٰہی کی مطلق کوئی جگہ نہیں۔ وہ مریم کے لئے قرآن مجید میں مذکور تعظیمی القاب سے بھی عاری ہے۔ وہ محض ایک عام سی عورت جس کی شناخت اس کے شوہر اور اس کے جلیل القدر بیٹے کے حوالے سے ہے۔ اس کا اپنا کوئی تشخص، کوئی مرتبہ، کوئی صفت نہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ حضرت مریم کے لئے قرآن مجید میں جو توصیفی کلمات آئے ہیں وہ خدیجہؓ، عائشہؓ اور فاطمہؓ تک کو عطا نہیں ہوئے ہیں۔

انجیل میں حضرت مریم کے ایک عام عورت ہونے کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کے اپنے شوہر یوسف سے زن وشو کے تعلق کے نتیجے میں کئی اور بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں: جیمس (James)، جوزف (Joseph)، سائمن (Simon)، اور جوداس (Judas) اور دو بیٹیاں بھی جن کے نام کی صراحت نہیں ہے۔

یہ ایک بظاہر ناقابل یقین، المناک حقیقت ہے کہ انجیل میں حضرت مریم کی بے توقیری کے اصل ذمہ دار خود حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ اپنی والدہ سے ان کے عدم التفات بلکہ صریحاً گستاخی کے متعدد شواہد انجیل میں محفوظ ہیں۔ مثلاً یہ اقتباس:

> یسوع کی ماں اور اس کے بھائی آئے اور باہر کھڑے ہو کر اسے بلوا بھیجا اور بھیڑ اس کے آس پاس بیٹھی ہوئی تھی اور انھوں نے یسوع سے کہا: دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر تجھ کو پوچھتے ہیں۔ یسوع نے ان کو یہ جواب دیا: میری ماں اور میرے بھائی کون ہیں؟ اور ان پر جو اس کے

اردگرد بیٹھے تھے نظر کر کے کہا: دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں[۳]۔

اس اقتباس میں اپنی والدہ سے جو رعونت آمیز بے رخی ہے، وہ بد تہذیبی ایک عام شخص کو روا نہیں، کجا یہ کہ اس کو رسول اللہ عیسیٰؑ سے منسوب کیا جائے جن کی قرآن مجید میں یہ عین صفت بیان کی گئی ہے: "اللہ نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا" (مریم۱۹: ۳۲)۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ اس آیت سے اس نے انجیل کے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مذکورہ بالا بہتان کی تردید کر دی۔ عام اخلاق اور صلہ رحمی کا تقاضا تھا کہ اس موقع پر حضرت عیسیٰؑ اپنی والدہ اور بھائیوں کا خیر مقدم کرتے اور مجلس میں ان کو شریک کرتے۔ ان کی پہلو تہی سے معاذ اللہ یہ متبادر ہوتا ہے کہ ان کی والدہ اور بھائی ان کے لائے ہوئے دین کے دائرے سے خارج تھے۔

اپنی والدہ سے انتہائی بے اعتنائی کا ایک اور یہ واقعہ انجیل یوحنا (۲: ۱-۱۱) میں درج ہے:

> قانا گلیلی (عربی: الجلیل) میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی وہاں دعوت تھی۔ جب شراب نوشی ہو چکی، یسوع کی ماں نے یسوع سے کہا: ان کے پاس اب شراب نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا: اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام... پھر یسوع نے کہا: ان مٹکوں میں پانی بھر دو پھر اس نے ان سے کہا: اب نکال کر ان کو میر مجلس کے پاس لے جاؤ... جب میر مجلس نے وہ پانی چکھا، وہ شراب بن چکا تھا اور وہ یہ جانتا نہ تھا کہ یہ شراب کہاں سے آئی... یہ پہلا معجزہ یسوع نے قانا گلیلی میں دکھا کر اپنا جلال ظاہر کیا اور اس کے شاگرد اس پر ایمان لے آئے[۴]۔

اس اقتباس کے متعدد پہلو عبرت ناک بھی ہیں اور انجیل کے محرف ہونے پر شاہد بھی۔ شراب نوشی کا ایسا عام رواج جس میں عیسیٰؑ اور مریم تک شریک؟۔ العیاذ باللہ!۔ مریم سے یہ بد سلوکی کہ ان کو "اے عورت" سے مخاطب کیا۔ پورے اقتباس میں یہ اہتمام ہے کہ مریم کا اسم گرامی نہ آنے پائے ہر جگہ ان کا ذکر بطور عیسیٰؑ کی ماں ہے۔ اپنی والدہ ماجدہ کے لئے کوئی تعظیمی لفظ تو درکنار توہین آمیز انداز میں ان کو عیسیٰؑ نے "اے عورت!" کہا۔ درحقیقت اس بے توقیری کے پس پشت انجیل کے مصنفین کا یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ عیسیٰؑ خود خدا تھے وہ کسی بشر، بشمول اپنی ماں کے،

---

[۳] ماخذ سابق، ص: ۳۷

[۴] ماخذ سابق، ص: ۸۲-۸۳

مرہون منت کیسے ہوتے اور ان کی تعظیم کیوں کر کرتے۔ وہ صرف ابن اللہ تھے، اپنے آپ کو ابن مریم سمجھنے یا کہنے میں ان کی سبکی ہوتی، لہٰذا انھوں نے ''اے عورت'' کا پیرایہ خطاب اختیار کیا۔ اپنی والدہ سے مطلق لاتعلقی اور اپنے خود مکتفی ہونے کا پندار ان کے اس جملے سے بھی عیاں ہے: ''اے عورت، مجھے تجھ سے کیا کام؟ ''۔ انجیل کی اس غلط بیانی کی تردید قرآن مجید نے اس بلیغ انداز میں کی ہے کہ جہاں بھی قرآن مجید میں عیسیٰؑ کا اسم گرامی آیا ہے، اس میں اضافہ ''ابن مریم'' کا ملتا ہے، بالفاظ دیگر حضرت عیسیٰؑ کی بشریت پر جابجا اصرار اور ان کی الوہیت کا انکار۔

اس سے بھی بڑھ کر شرمناک انجیل کا یہ بیانیہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جو پہلا معجزہ پیش کیا وہ پانی کو شراب میں تبدیل کرنا تھا تاکہ شادی کی تقریب میں سب مہمان بے تحاشا شراب نوشی کریں اور ان کے اسی معجزے کی بدولت ان کے حواری ان پر ایمان لے آئے۔ استغفر اللہ!

اپنی والدہ سے عیسیٰؑ کا یہ معیوب طرز تخاطب ان کے آخری دم تک قائم رہا۔ اس کا مظہر انجیل یوحنا (۲۵-۲۷:۱۹) کا یہ اقتباس ہے:

> یسوع کی صلیب کے پاس اس کی ماں، اس کی ماں کی بہن مریم، کلوپاس کی بیوی، اور مریم مگدلینی (مجدلیہ) کھڑی تھیں۔ یسوع نے اپنی ماں اور اپنے اس شاگرد کو جس سے وہ محبت رکھتا تھا، پاس کھڑے دیکھ کر ماں سے کہا: اے عورت! دیکھ یہ تیرا بیٹا ہے۔ پھر شاگرد سے کہا: دیکھ تیری ماں یہ ہے اور اسی وقت سے وہ شاگرد اسے اپنے گھر لے گیا[۵]۔

یہاں بھی مریم کا نام نامی نہیں آنے پایا گو ''مریم'' نامی دو خواتین کے نام باہتمام درج ہیں۔ مریم کی جانب صرف یہ اشارہ ہے: یسوع کی ماں۔ زیادہ حیرت انگیز منظر نامہ ہے: عیسیٰؑ صلیب پر کھڑے ہیں، آئندہ چند لمحوں میں مصلوب کر دیے جائیں گے۔ انجیل نے اس رقت انگیز اور اندوہ ناک موقع پر عیسیٰؑ کی والدہ مریم کو محض خاموش تماشائی کے طور پر پیش کیا۔ نہ رجوع الی اللہ کی توفیق، نہ دعا مناجات کی مشغولیت، نہ عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کو صبر اور تسلی کی تلقین، نہ رضائے الٰہی پر کاربند رہنے کا درس۔ ماں بیٹے کے انتہائی قریبی رشتے کی کیسی غیر فطری تصویر کشی ہے۔

اس آخری موقع پر بھی، جو موت اور جدائی پر منتج ہونے والا تھا، حضرت عیسیٰؑ نے اپنی والدہ معظمہ کو محض ''اے عورت'' سے خطاب کیا۔ دونوں کے درمیان کوئی الوداعی کلمات بھی ادا نہیں

---

[۵] ماخذ سابق، ص: ۱۰۴-۱۰۵

ہوئے۔ بے حسی کا یہ سفاکانہ رویہ ایک رسول اللہ سے منسوب ہے۔

ان ماں بیٹے کے مابین مطلق قطع تعلق کا مظہر انجیل کی یہ روایت بھی ہے کہ عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کے اگلے دن علی الصباح عیسیٰؑ کی قبر پر ان کی والدہ مریم نہیں بلکہ عیسیٰؑ کی ایک پیرو مریم مجدلیہ (Mary Magdalene) غم اور اندوہ سے بے قرار پہنچیں، انھوں نے عیسیٰؑ کی نعش کے نزد سفید پوشاک میں ملبوس دو فرشتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اسی اثناء میں عیسیٰؑ از سر نو زندہ ہو کر نمودار ہوئے اور انھوں نے مریم مجدلیہ سے کلام کیا اور ان کے توسط سے اپنے حواریوں کو پیغام روانہ کیا۔ انجیل میں مریم مجدلیہ کو عیسیٰؑ کے یہاں جو تقرب اور اعزاز بیان ہوا ہے، اس کا عشر عشیر بھی ان کی والدہ مریم کے نصیب میں نہیں آیا ہے۔ عیسیٰؑ کے اس پیغام میں بھی ان کی والدہ مذکور نہیں ہیں (یوحنّا ۱:۲۰-۱۸)۔ انجیل یوحنّا کے مصنف یوحنّا انتہائی عقیدت کے ساتھ راوی ہیں کہ مصلوب ہونے کے بعد تین مواقع پر عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے روبرو ظاہر ہوئے، ان سے مفصل کلام کیا اور ان کے سامنے معجزے بھی پیش کئے (یوحنّا ۱:۲۱-۲۵)۔ یہاں بھی مریم کا اشارۃً بھی ذکر نہیں گویا دونوں کے درمیان کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ انجیل میں غلط بیانی کے اس انبار کے پیش نظر قرآن مجید میں وارد عیسیٰؑ کے اس قول کی معنویت روشن تر ہوتی ہے: "اللہ نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا" (مریم ۱۹:۳۲)۔ قرآن مجید کے لاتعداد امتیازات میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں ایک حرف بھی غیر ضروری نہیں آیا ہے، ہر ہر لفظ جہانِ معنی سے آباد ہے۔ عیسیٰؑ کا یہ قول درحقیقت انجیل کے اس قابل نفریں بیانیے کا بطلان ہے کہ معاذ اللہ عیسیٰؑ کی نظر میں اپنی والدہ مکرمہ کی کوئی قدر و منزلت ہی نہ تھی۔

انجیل میں مریم کی ناقدری، خوش عقیدگی کے زیر اثر وضع کردہ اس افسانے کا بھی حصہ ہے جس کے مطابق بذریعۂ الہام دیار مشرق کے تین مجوسیوں کو ابن اللہ کی پیدائش کا علم ہوا اور وہ دور دراز کا سفر طے کر کے بیت لحم پہنچے۔ عیسیٰؑ کی جائے پیدائش تک ان کی رہنمائی ایک ستارے نے کی، وہ ستارہ ان مجوسیوں کے آگے آگے چلتا رہا اور عیسیٰؑ کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ یہ مجوسی نومولود عیسیٰؑ کے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور ان کو ڈھیروں سونا اور دیگر بیش قیمت تحائف نذر کیے۔ البتہ ان مجوسیوں نے بھی ان کی والدہ مریم کو مطلق ناقابل اعتنا ہی سمجھا حالانکہ ان ہی کی وساطت

سے عیسیٰؑ کی معجزاتی ولادت ہوئی تھی (متی ۱۱-۲:۲:۱۲)۔

قرآن مجید میں فرشتوں سے ہم کلامی کا شرف مریم کے لئے مختص ہے۔ انجیل میں اس کے برعکس یہ اعزاز اور تکریم ان کے شوہر یوسف کو حاصل ہے۔ جب یہودی بادشاہ ہیرود (Herod) نے نومولود عیسیٰؑ کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا "خداوند کے فرشتے نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر ان سے کہا: اٹھ بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر بھاگ جا" (متّی ۱۳:۲)۔ پھر جب ہیرود مر گیا تو "خداوند کے فرشتے نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر ان سے کہا: اٹھ بچے اور اس کی ماں کو لے کر اسرائیل کے ملک چلا جا کیونکہ جو بچے کی جان کے درپے تھے، وہ مر گئے" (متّی ۲۰:۲-۱۹)۔ ان اہم واقعات میں حسب معمول مریم کا کوئی کردار نہیں ہے۔ خدا اور فرشتوں کی نظر میں تمام تر اہمیت یوسف کی ہے۔

عیسائیت میں افراط و تفریط بلکہ غلو عام ہے۔ ایک جانب انجیل میں مریم کی ایسی ناقص تصویر کشی اور دوسری جانب مادرِ عیسیٰؑ یا مادرِ خدا ہونے کی حیثیت سے مریم کی پرستش عام ہے۔ گرجاگھروں میں ان کے مجسمے نصب ہیں۔ ان کے لئے عیسائیوں میں یہ شرکیہ تعظیمی القاب مروج ہیں: مادرِ خدا، ملکۂ جنت، ملکۂ ملائکہ اور ستارۂ سمندر۔ عیسیٰؑ سے ان کی نسبت کے پیش نظر ان کے شفیع اور نجات دہندہ ہونے کا عقیدہ بھی معروف ہے۔ ان کی پرستش متعین ایام پر تزک واحتشام کے ساتھ کی جاتی ہے، یادگاری جلوس اس پر مستزاد، کچھ کیفیت ہندو مذہب میں مختلف مذہبی شخصیات سے منسوب تہواروں اور جلوسوں کی سی۔ متعدد دعاؤں اور اوراد میں مخاطب صرف مریم کو کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت لازم ہے کہ عیسائیت میں حضرت مریم کی یہ تعظیم اور تقدیس صرف اس باعث ہے کہ وہ ابن اللہ عیسیٰؑ کی پیدائش کا وسیلہ ہیں، ورنہ انجیل کی رو سے ان کے کردار میں کوئی رفعت یا للّٰہیت نہیں۔ انجیل کے مطالعے سے قارئین کے قلب وذہن پر مریم کی پاکیزگی اور تعلق باللہ کی وہ ہلکی سی رمق بھی محسوس نہیں ہوتی جو قرآن مجید کے بیانیے کا خاصہ ہے۔ قرآن مجید میں حضرت مریم کا ذکرِ خیر مبسوط بھی ہے اور ان کی صفات عالیہ کا آئینہ دار بھی۔ قرآن مجید کے مطابق وہ صرف اس لئے قابل ذکر نہیں کہ وہ ایک عظیم پیغمبر الٰہی عیسیٰؑ کی والدہ ہیں بلکہ وہ اپنی

انفرادی، شخصی صفات اور کمالات کے باعث مقام رفیع پر فائز ہیں۔ قرآن مجید نے ان کو مثالی خاتون کے طور پر پیش کیا ہے۔ ذیل میں ان کے بارے میں قرآن مجید کے روح پرور اور ایمان افروز بیانیے کے اہم نکات پیش ہیں:

(۱) إِذْ قَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَارِزْقاً قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَـٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَرْزُقُ مَن يَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ.(آل عمران۳: ۳۵-۳۷).

(جب [مریم کی والدہ] عمران کی بیوی نے کہا کہ اے میرے رب! میرے پیٹ میں جو کچھ ہے، اسے میں نے تیرے نام آزاد کرنے کی نذر مانی ہے، تو میری طرف سے قبول فرما! یقیناً تو خوب سننے والا اور پوری طرح جاننے والا ہے۔ جب بچی کو جنا تو کہنے لگیں کہ پروردگار! مجھے تو لڑکی ہوئی، اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ کیا اولاد ہوئی ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں۔ میں نے اس کا نام مریم رکھا۔ میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس اسے اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول فرمایا اور اسے بہترین پرورش دی۔ اس کی خیر خبر لینے والا زکریا (علیہ السلام) کو بنایا۔ جب کبھی زکریا (علیہ السلام) ان کے حجرے میں جاتے تو ان کے پاس روزی رکھی ہوئی پاتے۔ وہ پوچھتے: اے مریم! یہ روزی تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ وہ جواب دیتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جسے چاہے بے شمار روزی دے)۔

(۲) وَإِذْ قَالَتِ الْمَلاَئِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَآءِ الْعَالَمِينَ. يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ. ذٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلاَمَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ. إِذْ قَالَتِ الْمَلآئِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ. وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً وَّ مِنَ الصَّالِحِينَ. قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَٰلِكِ اللهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ. (آل عمران۳: ۴۲-۴۷)

(اور جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے برگزیدہ کر لیا اور تجھے پاک کر دیا اور سارے جہان کی عورتوں میں سے تیرا انتخاب کر لیا۔ اے مریم! تو اپنے رب کی اطاعت کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تیری طرف وحی سے پہنچاتے ہیں، تو ان کے پاس نہ تھا جب کہ وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ مریم کو ان میں سے کون پالے گا؟ اور نہ تو ان کے جھگڑنے کے وقت ان کے پاس تھا۔ جب فرشتوں نے کہا: اے مریم اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو دنیا اور آخرت میں ذی عزت ہے اور وہ میرے مقربین میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے اپنے گہوارے میں باتیں کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی اور وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا۔ کہنے لگیں: الٰہی مجھے لڑکا کیسے ہوگا؟ حالانکہ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ فرشتے نے کہا: اسی طرح، اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کرتا ہے، جب کبھی وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا! تو وہ ہو جاتا ہے)۔

(۳) وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا. فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا. قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا. قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا. قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا. قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا. فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا. فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا. فَنَادَاهَا مِن تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا. وَهُزِّيْ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا. فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِيْ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا. فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا.يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا.فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا. قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا. وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِيْ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا. وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا. وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا. ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ. مَا كَانَ لِلَّهِ أَن يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ. وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ.(مریم ۱۹ : ۱۶-۳۶)۔

(اس کتاب میں مریم کا بھی واقعہ بیان کر۔ جبکہ وہ اپنے گھر کے لوگوں سے علیحدہ ہو کر مشرقی جانب آئیں اور ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا۔ پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح [جبرائیل علیہ السلام] کو بھیجا۔ پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ یہ کہنے لگیں: میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو کچھ بھی اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں، تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دینے آیا ہوں۔ کہنے لگیں: بھلا میرے یہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے تو کسی انسان کا ہاتھ تک نہیں لگا اور نہ میں بدکار ہوں۔ اس نے کہا: بات تو یہی ہے۔ لیکن تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ وہ مجھ پر بہت ہی آسان ہے، ہم تو اسے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنادیں گے اور اپنی خاص رحمت۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے۔ پس وہ حمل سے ہو گئیں اور اسی وجہ سے وہ یکسو ہو کر ایک دور کی جگہ چلی گئیں پھر دردِ زہ ان کو ایک کھجور کے تنے کے نیچے لے آیا۔ بولیں: کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور لوگوں کی یاد سے بھی بھولی بسری ہو جاتی۔ اتنے میں اسے نیچے سے ہی آواز دی کہ آزردہ خاطر نہ ہو، تیرے رب نے تیرے پاؤں تلے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، یہ تیرے سامنے تروتازہ پکی کھجوریں گرادے گا۔ اب چین سے کھاپی اور آنکھیں ٹھنڈی رکھ، اگر تجھے کوئی انسان نظر پڑ جائے تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ رحمٰن کے نام کا روزہ مان رکھا ہے، میں آج کسی شخص سے بات نہ کروں گی۔ اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو لئے ہوئے وہ اپنی قوم کے پاس آئیں۔ سب کہنے لگے: مریم تو نے بڑی بری حرکت کی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ مریم نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ سب کہنے لگے کہ لو بھلا ہم گود کے بچے سے باتیں کیسے کریں؟ بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے اور اس نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں بھی میں ہوں، اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک بھی میں زندہ رہوں اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا اور مجھ پر میری پیدائش کے دن اور میری موت کے دن اور جس دن کہ میں دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا، سلام ہی سلام ہے۔ یہ ہے صحیح واقعہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کا۔ یہی ہے وہ حق بات جس میں لوگ شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا ہونا لائق

نہیں، وہ تو بالکل پاک ذات ہے، وہ تو جب کسی کام کے سرانجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔ میرا اور تم سب کا پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تم سب اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے)۔

(۴) وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعَالَمِينَ. (الأنبياء۲۱:۹۱)

(اور وہ پاک دامن بی بی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور خود انہیں اور ان کے لڑکے (عیسیٰؑ) کو تمام جہان کے لئے نشانی بنا دیا)۔

(۵) وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ. (التحریم۶۶:۱۲)

(اور اللہ نے مثال بیان فرمائی۔۔۔ مریم بنت عمران کی جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی پھر ہم نے اپنی طرف سے اس میں جان پھونک دی اور (مریم) اس نے اپنے رب کی باتوں اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ عبادت گزاروں میں سے تھی)[۶]۔

موازنے کے مزید پہلو:

(۱) انجیل میں مریم کے وضع حمل کا مرحلہ اور اس جاں گسل مرحلے میں اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کے ذریعے ان کے لئے اشیائے خورد و نوش کی فراہمی اور ان کی تسلی اور تشفی جیسے اہم واقعات مفقود ہیں گویا مریم اس مرتبے کی مستحق نہ تھیں۔ اس حذف سے عیسیٰؑ کی معجزاتی پیدائش کا استخفاف بھی ہوتا ہے جو کلیسا کو گوارا ہے۔

(۲) نو مولود عیسیٰؑ نے گہوارے ہی میں معجزے کا اظہار کرتے ہوئے بات کی اور اپنی عفیفہ و صالحہ والدہ کی براءت ثابت کی۔ یہ معجزہ ایسا تھا کہ مریم کے معترضین اور معاندین لاجواب رہ گئے۔ یہ اہم واقعہ بھی انجیل سے ساقط ہے۔ یہ انجیل میں تحریف اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔

(۳) انجیل کے مناظرہ باز اسلام دشمن شارحین کو بڑا ملال اور اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید نے

---

[۶] قرآن مجید کے اردو ترجمے کے اقتباسات کا مصدر یہ ہے: قرآن کریم مع اردو ترجمہ و تفسیر از محمد جوناگڑھی و حافظ صلاح الدین یوسف، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ، ۱۹۹۶۔

نومولود عیسیؑ کے سامنے مشرق کے تین مجوسیوں کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کی وحدانیت اور صرف اس کے رب العالمین ہونے کا جو بنیادی عقیدہ ہے، اس کی رو سے ایسے شرکیہ بیان سے اجتناب قرآن مجید کے متن کی صحت اور انجیل میں شرک آمیز اضافے اور تحریف کا شاہد ہے۔ قرآن مجید نے جابجا مریم اور عیسیٰؑ دونوں کی محض بشر ہونے کا اعلان کیا ہے تاکہ ان کی مبینہ الوہیت کا شائبہ بھی کسی کے ذہن میں نہ رہے۔

(۴) انجیل میں عیسیٰؑ کے مصلوب کئے جانے کے بعد مریم کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ وہ ان کی بقیہ زندگی اور وفات کے بارے میں ساکت ہے، گو کہ اس میں دیگر فروعی نکات کی تفصیل در تفصیل موجود ہے۔ ایک عام خاتون کی طرح مریم کی اپنے شوہر یوسف سے متعدد بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوتے رہے۔

(۵) قرآن مجید کی عین صراحت ہے کہ اللہ نے مریم کو اپنی خدمت کے لئے قبول کیا اور ان کی بہترین پرورش کا نظم کیا۔ معجزاتی طور پر اپنے حجرے میں ان کو اللہ کی ایسی نعمتیں حاصل ہوتی رہتیں جن پر ان کے سرپرست رسول اللہ زکریاؑ کو تعجب ہوتا اور رشک بھی آتا (آل عمران ۳:۳۷)۔ مریم کے ساتھ اللہ کی ان خصوصی عنایات کے تذکرے سے انجیل کے صفحات خالی ہیں۔

(۶) قرآن مجید میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گاہ میں نوعمر مریم کی سرپرستی ایسی سعادت تھی جس کے حصول کا ہر شخص طلب گار تھا۔ یہ معاملہ قرعہ اندازی سے طے پایا اور یہ خوش بختی رسول اللہ زکریاؑ کے نصیب میں آئی (آل عمران ۳:۴۴)۔ مریم کے اس خصوصی اعزاز کے باب میں انجیل ساکت ہے۔

حاصل کلام: انجیل اور قرآن مجید میں "مریم" نام کی شخصیت بلاشبہ مشترک ہے لیکن اپنے کردار کی رفعت اور صلابت، اپنے تعلق باللہ، اپنے قابل رشک خصوصی مرتبے، اپنی عفت اور عصمت کی حفاظت اور رضا بہ تقدیر الٰہی کے لحاظ سے قرآن مجید میں مذکور مریم کی انجیل کی مریم کے سطحی، ناقص اور کسی بھی امتیاز سے عاری کردار سے کوئی نسبت نہیں۔ اس بین فرق کی بنیاد پر بائبل کو قرآن مجید کا ماخذ متصور کرنا کورچشمی اور لاعلمی کی انتہا ہے اور جو اس بے بنیاد مفروضے کا قائل ہو، اس کی عقل پر صرف ماتم ہی کرنا چاہئے کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اقبال سہیل اور سہیل شناسی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
azmi408@gmail.com

مولانا اقبال احمد خاں سہیل (۱۸۸۴-۱۹۵۵ء) ایم اے، ایل ایل بی، علیگ، اعظم گڑھ کے ممتاز ترین فرزندوں میں سے تھے۔ نامور شاعر، ادیب اور نقاد تھے، علامہ شبلی، مولانا حمید الدین فراہی اور بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر مولوی محمد شفیع صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار ہندوستان کے بڑے نامی گرامی شعرا میں ہوتا ہے، انہیں اردو، عربی و فارسی اور انگریزی کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے جامع الصفات عالم وفاضل اور اہل علم وقلم تھے۔ حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا اخاذ پایا تھا۔ ان کی ذہانت و فطانت کی مثال مشکل ہی سے ملے گی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذہانت و فطانت، زیرکی، بالغ نظری اور قوت حفظ میں ان کے اساتذہ بھی ان سے ممتاز نہیں تھے۔

مولانا سہیل مرحوم اردو اور فارسی کے نہایت قادرالکلام شاعر تھے، تاحیات دادِ سخن دیتے رہے، انہیں مملکت شعر وسخن پر کشور کشائی کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جس محفلِ شعر وسخن میں شریک ہو جاتے اسے اپنے فن کی بلندی، بدیہہ گوئی، برجستگی، رچے ہوئے شاعرانہ مذاق اور خوش فکری سے محفل کو گل و گلزار بلکہ رشکِ چمن بنا دیتے۔ ان کے معاصرین اور متعدد نامور ادیبوں اور نقادوں نے ان کے ان اوصاف کا برملا اعتراف کیا ہے اور بعضوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ان کا ان کے عہد میں ان کا نہ کوئی مثیل تھا اور نہ بدیل۔

زمانۂ تحصیل میں علی گڑھ میں سیاست کا انہیں جو چسکا لگا وہ مدۃ العمر باقی رہا۔ ایک بار ۱۹۳۵ء میں وہ ایم ایل اے بھی منتخب ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسمبلی میں اس کی کارروائی منظوم سنا دیتے تھے۔ حیرت زدہ کر دینے والا یہ واقعہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور غیر معمولی قوتِ حفظ کا کمال یا خدا داد صلاحیت ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

آخری بڑا قصیدہ نگار: مولانا سہیل مرحوم نظم و غزل دونوں پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ نقادوں کے درمیان یہ فیصلہ آج تک نہیں ہو سکا کہ مولانا سہیل نظم نگار بڑے تھے یا غزل گوئی

میں علوئے مقام و مرتبہ کے حامل تھے۔ ہر صاحب ذوق کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ مجھے وہ نظم نگاری میں زیادہ بلند رتبہ نظر آتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب ان کی قصیدہ نگاری میں مہارت و جلالت ہے جس میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پروفیسر محمود الٰہی مرحوم نے لکھا ہے کہ:

> اقبال سہیل کو اردو کا آخری بڑا قصیدہ نگار کہا جاسکتا ہے۔ سہیل نے اس صنف کی تہذیب وترتیب پر بڑی توجہ کی۔ ان کے قصیدے کے مطالعے سے یہ تصور غلط معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس صنف سے صرف قدرت کلام کا اظہار مقصود ہوتا ہے، ورنہ اس میں پیچ در پیچ خیالات، بے جا مبالغے، بھاری بھر کم الفاظ وتراکیب کے سوا دھرا کیا ہے[1]؟

سہیل کا عربی، فارسی اور اردو شاعری کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی علمیت اور قابلیت معاصرین میں مسلم تھی۔ وہ سنی سنائی اور پڑھی لکھی باتوں کو پیچیدہ بنا کر اور مرعوب کر دینے والے الفاظ میں کہہ سکتے تھے، خواہ ان باتوں کے اثرات ان کے دل و دماغ پر نہ ہوتے مگر انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے یہاں مذہب وسیاست کا ایک واضح تصور تھا۔ اس تصور سے ان کی زندگی کو پایندگی اور بالیدگی ملی اور یہی تصور ان کے قصیدوں میں ڈھل گیا، قصیدہ سہیل کے یہاں جذباتی شاعری کا قابل قدر نمونہ بن جاتا ہے۔[2]

یہاں اس بحث سے اس لئے صرف نظر کیا جاتا ہے کہ اس موضوع پر ہمارے بزرگ ادیبوں اور نقادوں رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ نے بہت کچھ لکھا ہے اور یہاں ان کے قصائد کی توصیف کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

قصیدہ ہی کی طرح انہیں غزل گوئی میں بھی کمال حاصل تھا جس کا ذکر آیندہ صفحات میں آرہا ہے۔ یہاں لطافت طبع کے لئے ان کی ایک غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے
صبح ازل سے دل پہ نظر آسماں کی ہے
یہ گرد کس کے جلوۂ دامن فشاں کی ہے

---

[1] پروفیسر محمود الٰہی، اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۴۷۱-۴۷۲
[2] ماخذ سابق

دل کھول کر تڑپنے کا سامان کیا کریں
کتنی بساط وسعت کون و مکاں کی ہے
کونین ایک گوشہ ہے اس کی بساط کا
یا رب! حریم دل میں یہ وسعت کہاں کی ہے
صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے
تیرے کرم کی شکل وہی آشیاں کی ہے
کب تک شہید شیوۂ رندانہ اے سہیل
تیری نوا تو بزم گہہ قدسیاں کی ہے[۳]

ایک دوسری غزل کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ عطر بیزیاں نہیں نسیم نو بہار کی
صبا اڑا کے لائی ہے شمیم زلف یار کی
بلند بختیاں ہیں کس نشیمن ہزار کی
فضا میں موج مضطرب ہے برق شعلہ بار کی
بس اتنی کائنات ہے حیات مستعار کی
شباب ہے حباب کا بہار ہے شرار کی
فریب کاریاں نہ پوچھ جوش انتظار کی
تمام شب سنا کئے صدا خرام یار کی
یہ مختصر سی داستاں ہے جبر و اختیار کی
کرشمہ ساز کوئی ہو خطا گناہ گار کی
سہیل تیری شاعری ہے یا فسون سامری
روانیاں ہیں نظم میں خرام جوئبار کی[۴]

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کا مہمان خانہ ہندوستان کا ایک تاریخی مہمان خانہ ہے۔

---

[۳] کلیات سہیل، ص ۱۹۹

[۴] ماخذ سابق، ص ۲۰۲

اس میں ہندوپاک، افغانستان اور بعض عرب ممالک کے ممتاز اور نامور اہل علم و کمال قیام کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں نے بھی یہاں ٹھہرنا فخر و عزت سمجھا۔ زمانۂ جنگ آزادی میں تو یہ مجاہدین آزادی کا گویا اپنا گھر تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو (۱۸۶۱ - ۱۹۳۱ء)، پنڈت جواہر لال نہرو (۱۸۸۹- ۱۹۶۴ء)، لال بہادر شاستری (۱۹۰۴ - ۱۹۶۶ء) وغیرہ جب دیارِ پورب کے دورے پر آتے تو ان کا یہی مسکن ہوتا تھا۔ اس کی تاریخ و تفصیل قلم بند کرنے میں ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ راقم نے گذشتہ سال ایک مقالہ بعنوان 'مسافرانِ شبلی منزل' لکھا تھا جو مجلہ "فکر و تحقیق" نئی دہلی میں شائع ہوا ہے اور اب راقم کی کتاب 'بیان شبلی' حصہ پنجم میں شامل ہے۔ اس میں اس تاریخی مہمان خانہ کی تفصیل بھی کسی قدر آگئی ہے۔ یہاں بس اس قدر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہمان خانہ علامہ شبلی نے ۱۹۱۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۲۷ء میں تلامذۂ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ موجودہ عمارت وہی ہے، بس رنگ و روغن نیا ہے۔

ملک الشعرا سرور خاں گویا کی نظر میں: ۱۹۳۸ء میں دارالمصنّفین شبلی منزل اعظم گڑھ میں افغانستان کے ملک الشعرا سرور خاں گویا (۱۲۸۰-۱۳۴۶ھ)، جنہوں نے علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق کتاب " شعر العجم " کے حصہ سوم کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے کابل سے شائع کرایا تھا، تشریف لائے اور دارالمصنّفین کے مہمان ہوئے۔ ملک الشعراء سرور خاں گویا کے اعزاز میں دارالمصنّفین نے ایک محفل شعر و سخن کا انعقاد کیا، جس میں دارالمصنّفین کے شعرا مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) مولانا عبدالسلام ندوی شمیمؔ (۱۸۸۳- ۱۹۵۶ء) اور مرزا احسان احمد (۱۸۹۶- ۱۹۷۲ء) وغیرہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا اقبال سہیل نے ایک فارسی قصیدہ سنایا۔ اس کی سماعت کے بعد ملک الشعرا سرور خاں گویا نے اٹھ کر بے تابانہ انہیں سینے سے لگالیا اور پھر اپنا کلام بڑی مشکل سے سنانے کو راضی ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اب اقبال سہیل کے بعد میں اپنا کلام کیا سناؤں؟ اس واقعے سے فارسی قصیدہ نگاری میں ان کے بلند مقام و مرتبہ اور ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی موقع پر ملک الشعرا سرور خاں گویا نے ازراہِ مذاق کہا تھا کہ "جب کبھی ہندوستان پر افغانستان نے حملہ کیا تو میں سہیل کو (مال غنیمت میں)

لوٹ کر لے جاؤں گا"۔[۵]

لیکن اقبال سہیل جس قدر بلند رتبہ شاعر تھے اسی قدر اپنے کلام کی حفاظت کے معاملہ میں بے پرواتھے۔شاید ہی انہوں نے اپنا کلام کبھی محفوظ رکھا ہو۔اس کا خود ان کو بھی احساس تھا۔ان کا کلام ان کے عزیزوں اور شاگردوں نے یکجا کر کے ان کی خدمت میں اشاعت کے لئے پیش کیا، لیکن وہ ان سے کسی طرح ضائع ہو گیا، جس کا ان کو بڑا ملال تھا اور کہتے تھے کہ ایک تو میں نے اپنے کلام کی حفاظت نہیں کی اور جب عزیزوں نے جمع کیا تو وہ بھی مجھ سے ضائع ہو گیا۔[۶]

قوت حفظ: ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ تمام عمر وہ اپنا کلام زبانی سناتے رہے اور نہ صرف اپنا کلام بلکہ اردو و فارسی کے اساتذہ اور معاصر شعرا کا متنوع کلام ان کے ذہن کے پردے پر نقش تھا۔ اپنے طویل قصائد وہ زبانی ہی سنایا کرتے تھے۔ان کا شہرۂ آفاق نعتیہ قصیدہ "موج کوثر" تو گویا انہیں ازبر ہی تھا اور اس کے سنانے کی اکثر ان سے فرمائش بھی کی جاتی تھی اور وہ اسے بڑے شوق سے سناتے تھے۔

مکتوب بنام مولانا اسلم جیراجپوری: مولانا محمد اسلم جیراجپوری نے انہیں تحفظ و اشاعت کلام کے سلسلہ میں ایک خط لکھا تھا جو باوجود تلاش بسیار کے دستیاب نہیں ہوا۔اس کے جواب میں مولانا اقبال سہیل نے جو خط لکھا ہے، وہ ان کی عظمت کا ایسا بیانیہ ہے کہ محض اس کی توضیح میں ان کی پوری شخصیت منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ طوالت کے باوجود ہم ان کے اور ان کی شاعری کے ذکر سے پہلے اس مکتوب کو نقل کرتے ہیں:

مخدوم مکرم زاد مجد ہم!

> گرامی نامہ موجب سرفرازی ہوا۔موج کوثر کے متعلق آپ جیسے بزرگوں اور ارباب نظر کے کلماتِ تحسین اور مخلصانہ ہمت افزائی میرے لئے یقیناً ایک غیر مترقبہ نعمت ہے۔
> آپ کو معلوم ہے کہ میں نے زندگی بھر شعر کہے اور کبھی اشاعت کی پروا نہ کی، بلکہ دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمایہ کو بھی ضائع کر دیا لیکن یہ نظم جو محض اپنی بچی کو "برہرہ" کی زنانہ محفل میلاد میں پڑھنے کے لئے لکھ دی تھی اور عزیزی عبدالرؤف سلمہ مالک 'سودیشی دکان'

---

[۵] مولانا ضیاء الدین اصلاحی، انتخاب کلام سہیل، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۹ء، ص ۹

[۶] ارمغان حرم، ص: ذ

کے اصرار پر چھپوا دی، اس درجہ مقبول ہوئی کہ اب خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم نعت و منقبت کا مجموعہ تو چھپوا دوں۔

'موج کوثر' میں ایک خوبی تو ضرور ہے کہ درود شریف ہر شعر میں ردیف ہے، ورنہ میری دوسری نعتیں اور منقبتیں ادبی اور فنی حیثیت سے اس نظم سے بدرجہا بلند تر ہیں۔ حدود شریعت کی پابندی کا لحاظ دوسری نظموں میں اس نظم سے بھی زیادہ ہے اور عام طور پر نعتوں میں جو حسن صورت کی مداحی اور تغزل کا انداز مولانا جامی کے عہد سے آج تک معمول بہ تھا یا دوسرے انبیاء ورسل کا استخفاف، غیر ضروری اور بے معنی مبالغہ یا لفظوں کی صنعت گری اور خیال آفرینی، جو عرفی وغیرہ نے رائج کی اور محسن کاکوروی مرحوم نے اردو میں بھی منتقل کی، ان سے قطعی احتراز ہے، مگر سادہ و بے نمک بھی نہیں، شکوہ بیان اور بلندی ادا کا دامن ہاتھ سے کہیں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ ان قیود کی پابندی سے زبان ضرور کسی حد تک مشکل ہے مگر میرا عام انداز تحریر نثر اور نظم دونوں میں اب تک یہی تھا۔ علاوہ بریں ایک نعت کے سوا جس کو لکھے ہوئے ۲۲ سال ہوگئے، بقیہ تمام نعتیں صحیح طور پر درود شریف کا ترجمہ ہیں، یعنی کم سے کم خلفائے راشدین کی منقبت بھی ضرور التزاماً شامل نعت رکھی گئی ہیں۔

نعتوں کے علاوہ حضرات شیخین، جناب امیر حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی منقبت میں علاحدہ نظمیں بھی ہیں جو مذہبی اور فنی ہر حیثیت سے معیاری ہیں۔ حضرت ذوالنورین کی شہادت پر ایک نظم لکھ رہا ہوں، عہد خلافت کے اور واقعات یا مخصوص جو حضرت خالد، حضرت امیر معاویہ، حضرت سعد بن وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح سے متعلق ہوں، اگر آپ ان میں سے کوئی واقعہ منتخب کر کے لکھ بھیجیں تو ان کو بھی نظم کر دوں۔

انشاء اللہ آئندہ نعتیہ نظموں میں سادگی زبان کی بھی کوشش کروں گا مگر چھپوانے میں آج کل دقت یہ ہے کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے غیر معمولی مصارف پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے خیال تھا کہ اگر 'موج کوثر' کافی تعداد میں فروخت ہو جاتی تو اسی آمدنی سے بقیہ نعت و منقبت کا مجموعہ بھی فوراً چھپوا دیتا، ورنہ اختتام جنگ کا انتظار کرنا پڑے گا۔ والسلام

اقبال سہیل

۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء

اس طویل خط سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ انہوں نے نعت نگاری پر کس درجہ توجہ مرکوز کر رکھی تھی اور وہ کس قدر اہتمام سے نعت نبویؐ لکھتے تھے اور نعت نگاری میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا

اور انہوں نے اس فن میں کس قدر اہم اضافہ کیا ہے۔

رشک تو علامہ شبلی پر آتا ہے کہ ایک شاگرد سیرت نگار، دوسرا نعت نگار اور تیسرا اسوۂ صحابہ کا تجزیہ نگار، گویا شبلی کی بدولت دبستان شبلی کی پوری ادبی فضا حب نبویؐ میں سرشار تھی۔

مختصر سوانح: علامہ اقبال سہیل کے اجداد سوات سے نقل مکانی کرکے جونپور میں آبسے تھے۔ ان کے دادا نے اعظم گڑھ کے ایک موضع بڑھریا میں جہاں ان کی سسرال تھی سکونت اختیار کی۔ ۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو اقبال سہیل وہیں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے لئے رسم زمانہ کے موافق مولوی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو منتخب کیا گیا، پھر مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۴ - ۱۹۳۰ء) اور علامہ شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) سے بھی علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ اسی زمانہ میں ان کی شادی بنارس میں ہوئی، چنانچہ مزید تعلیم کے لئے انہیں بنارس کے مشہور کوین کالج جس میں سرسید احمد خاں نے جسٹس سید محمود (۱۸۵۰- ۱۹۰۳ء) کو تعلیم دلائی تھی داخل کیا گیا۔ وہاں سے ۱۹۱۳ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ۱۹۱۴ء میں سہیل صاحب نے ایم اے او کالج علی گڑھ کا رخ کیا اور علی گڑھ سے ایم اے، ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ وہ ایم اے او کالج کے نامور تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں تکمیل کے بعد اعظم گڑھ واپس آئے اور پھر پوری زندگی اعظم گڑھ کی کچہری کی نذر کردی اور وکالت اور قانونی داؤ پیچ میں خود کو برباد کرڈالا۔ افسوس جسے علامہ اقبال سہیل ہونا تھا وہ اقبال سہیل وکیل ہوکر رہ گیا۔ البتہ اس میں بھی اس زمانہ میں کوئی ان کا حریف مقابل نہ تھا۔

سروجنی نائیڈو: جب وہ علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے مسز سروجنی نائیڈو علی گڑھ کالج کے ایک جلسے میں تشریف لائیں۔ اقبال سہیل اس حالت میں کہ آنکھوں پر آشوب چشم کی بنا پر پٹی بندھی ہوئی تھی، بلبل ہند سروجنی نائیڈو (۱۸۷۹-۱۹۴۹ء) کو منظوم استقبالیہ پیش کیا، جسے مسز نائیڈو نے بے حد پسند کیا۔ آزادی کے بعد جب وہ اترپردیش کی گورنر منتخب ہوئیں اور ایک بار دارالمصنّفین اعظم گڑھ تشریف لائیں اور انہیں معلوم ہوا کہ یہاں اقبال احمد خاں سہیل موجود ہیں تو انہوں نے علی گڑھ کالج میں پڑھی گئی اس استقبالیہ نظم کو دوبارہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ اقبال سہیل صاحب نے وہ پوری نظم برسوں بعد پھر زبانی سنائی۔ اس سے ان کے بے مثال قوت حافظہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے قصائد زبانی سنانے کا ذکر حکیم سید مصلح الدین ثاقب کاظمی مرحوم نے ان

کی ناتمام سوانح عمری ”سہیل تاباں“ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

آپ کہیں گے کہ کتنا ضخیم دیوان تھا ان کے ہاتھوں میں؟ تو جناب سماعت فرمائیں کہ یہ سب کچھ ان کے دماغی دیوان کی کرشمہ سازیاں تھیں، اور یہ سارے قصائد زبانی اور صرف زبانی سنائے جارہے تھے۔ اللہ اکبر! محدثین میں امام بخاری وامام ترمذی، فقہا میں امام شافعی وامام حنبل کے اور شعرا میں ابونواس وغیرہ کے حیرت انگیز حافظے سنتے چلے آئے تھے، مگر اس دور میں مرحوم کا حافظہ بچشم خود دیکھنے کو مل گیا۔(۷)

نعتیہ قصائد: قصائد وغزلیات کے علاوہ ان کا محبوب موضوع سخن نعت نگاری تھا۔ ”موج کوثر“ ان کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ بھی بڑی عمدہ عمدہ نعتیں لکھی ہیں بلکہ خود سہیل صاحب اسے دوم درجہ کی نعت خیال کرتے تھے۔ ایک مشہور نعت جس کا مطلع ہے:

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

ناچیز کی معلومات کے مطابق اردو میں ایسی خوب صورت نعت نبویؐ لکھی ہی نہیں گئی۔ لیکن سہیل صاحب کی نعتوں میں جو شہرت دوام ”موج کوثر“ کو ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ ”موج کوثر“ ان کے کلیات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس کا ذکر ان کے خط میں آچکا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

احمد مرسل، فخر دو عالم، صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر اول، مرسل خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم
جسم مزکّٰی، روح مصور، قلب مجلّٰی، نور مقطر
حسن سراپا، خیر مجسم، صلی اللہ علیہ وسلم
طینت جسکی سب سے مطہر، بعثت جسکی سب سے مؤخر
خلقت جس کی سب سے مقدم، صلی اللہ علیہ وسلم
فرد وجماعت، امر واطاعت، کسب وقناعت، عفو وشجاعت
حل کئے جو اسرار تھے مبہم، صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۷) ماہنامہ ادیب علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۲ء، ص: ۳۳

ربط و تصادم، طوع و تحکم، فقر و تنعم، عدل و ترحم
سب کے حدود بتائے باہم، صلی اللہ علیہ وسلم
وہ مصداق "دَنیٰ فتدلّٰی" جس کی منزل عرش معلّی
نکتۂ "ما اوحیٰ" کا محرم، صلی اللہ علیہ وسلم
جتنے فضائل، جتنے محاسن، ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن
حق نے کیے سب اس میں فراہم، صلی اللہ علیہ وسلم
علم لدنی، شان کریمی، خلق خلیلی، نطق کلیمی
زہدِ مسیحا، عفّت مریم، صلی اللہ علیہ وسلم
بندہ اور خدا سے واصل، خاکی اور انوار کا حامل
اُمی اور اسرار کا محرم، صلی اللہ علیہ وسلم
صدر امم، سلطانِ مدینہ، وہ جس کے کفِ پا کا پسینہ
گل کدۂ فردوس کی شبنم، صلی اللہ علیہ وسلم[۸]

قسمت کی یاوری دیکھئے کہ وہ اپنے کلام سے جتنے بے پرواتھے، ان کے تلامذہ اوراحباب ومعاصرین اس سے کہیں زیادہ ان کے مخلص، خیر خواہ، ہمدرد اور محبت کرنے والے تھے۔ ابتدا میں مسلم یونیورسٹی کے ترجمان ماہنامہ "علی گڑھ منتھلی" میں ان کی متعدد نظمیں، غزلیں اور قصائد وقطعات شائع ہوئے۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر ذاکرحسین خاں (۱۸۹۷-۱۹۶۹ء) سابق صدر جمہوریۂ ہند، مرزا احسان احمد اور پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۸۹۴-۱۹۷۷ء) ان کے ہم سبق تھے۔ رشید احمد صدیقی نے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اردو" اور مجلہ "سہیل" اور پھر "علی گڑھ میگزین" جن کے وہ مدیر رہے، ان میں علامہ سہیل مرحوم کا کلام نظمیں اور غزلیں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سہیل مرحوم جس رتبے کے شاعر وادیب تھے، ان کی زندگی میں ہمارے نقّادوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔

انتقال: ۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو شعر وادب کا یہ نیّر تاباں اعظم گڑھ میں غروب ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد رشید احمد صدیقی کے بھائی اور محمد حسن ڈگری کالج جونپور کے پرنسپل نیاز احمد صدیقی نے ان

---

(۸) کلیات سہیل، ص ۴۱

کا کلام نہایت تلاش و تفحص سے یکجا کیا اور محمد حسن کالج میگزین جونپور کا ''سہیل نمبر'' شائع کیا۔ آج یہی نمبر سہیل شناسی کا بنیادی ماخذ ہے۔ شبلی کالج کی سالانہ میگزین کے مدیر نے بھی ''گوشۂ سہیل'' شائع کیا تھا مگر وہ کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکا اور ہم اس سے استفادہ سے محروم رہے۔

اس سہیل نمبر کا آغاز مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر ''تابش سہیل'' سے ہوا ہے۔ تاثرات ان کے ہم سبق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور مقدمہ مولانا شاہ معین الدین ندوی کے قلم سے ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور کے عالمانہ مضامین اور عرض نیاز، نیاز احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ اس میں اقبال سہیل کے قصائد، نعت، منقبت، ملی، قومی و سیاسی نظموں کے علاوہ سہرے اور متفرقات کے بعد غزلیات شامل کی گئی ہیں۔ آخر میں نوائے شیراز کے عنوان سے فارسی کلام شامل ہے۔ فارسی قصائد و مراثی، نوحۂ استاد شبلی اور دیگر متفرق نظمیں بھی شامل ہیں۔

افکار سہیل: اگست ۱۹۵۷ء میں شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل مرحوم شوکت سلطان (۱۹۱۶-۱۹۸۶ء) نے انگریزی کے استاد میجر علی حماد عباسی (م: ۱۱ جولائی ۱۹۹۷ء) کے تعاون سے سہیل صاحب کے ادبی و تنقیدی مضامین، نقد و تبصرے، مکتوبات و خطبات وغیرہ کو ''افکار سہیل'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں علامہ کے حالات و سوانح، ادبی اور شاعرانہ کارناموں کا ذکر، مختلف اہل علم کے قلم سے ہے۔ اس حصے میں بیشتر مضامین محمد حسن کالج میگزین میں شامل ہیں، لیکن متعدد اضافوں کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔ البتہ دوسرا حصہ خود سہیل صاحب کے رشحات قلم پر مشتمل ہے۔ ان میں ان کی نثری کاوشیں بھی شامل کی گئی ہیں اور ان کے خطوط و خطبات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ بلاشبہ 'افکار سہیل' سہیل شناسی کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کے بغیر سہیل کا مطالعہ و جائزہ نامکمل ہی قرار دیا جائے گا۔

اس کے بعد اگرچہ ان کی شخصیت اور شاعری پر وقتاً فوقتاً مضامین لکھے جاتے رہے، لیکن سہیل شناسی کا مستقل بیڑہ ان کے ایک عزیز شاگرد افتخار اعظمی (۱۹۳۲- ۱۹۹۴ء) نے اٹھایا۔ اقبال احمد سہیل مرحوم کی غزلوں کا مجموعہ 'تابش سہیل' اور نعتوں کا مجموعہ 'ارمغان حرم' انہی نے مرتب کر کے شائع کرایا اور ان سے جہاں تک بن پڑا ان کا کلام نہایت تلاش و جستجو سے حاصل کیا اور سلیقے سے ترتیب دے کر شائع کرایا۔ ان مجموعوں میں حیات سہیل اور ان کی بلند رتبہ شاعری پر

معاصرین کے مقالات اورآراء وخیالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ گویا انہوں نے خود تو لکھا ہی، دیگر اہل قلم کی تحریریں اور مضامین بھی شائع کئے۔

مولانا اقبال سہیل کے متعدد تلامذہ نے ان کی شعری روایت سے شغف رکھا، استفادہ کیا اوران کے فکر وفن کو ترقی دینے کی پیہم کوشش کی اور میدان شعر وسخن میں بڑی عزت وعظمت پائی۔ ان میں دارالمصنّفین کے ممتاز شاعراوراقبال احمد خاں سہیل کے چہیتے شاگرد یحییٰ اعظمی (۱۹۰۶- ۱۹۷۲ء)، اختر مسلمی (۱۹۲۸- ۱۹۸۹ء)، محمد امین اللہ امین اعظمی (۱۹۰۳ -۱۹۶۶ء)، جگر مرادآبادی (۱۸۹۰-۱۹۶۰ء)، امجد علی غزنوی (۱۹۲۴-۱۹۹۶ء)، پروفیسر حاذق (استاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، حکیم سید مصلح الدین ثاقب کاظمی (۱۹۱۴- ۱۹۷۳ء)، ہادی اعظمی، منیر دیوگامی (م: ۲۲جنوری ۱۹۸۳ء) ، محمد عمر شمس الاسلام معروف بہ اسلم سہیل جونپوری (پ:۱۹۳۶ء) اورافتخار اعظمی (۱۹۳۲- ۱۹۹۴ء) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں اسلم سہیل صاحب بقید حیات ہیں۔ ان سے میری ایک بار جونپور میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مرحوم (۱۹۵۸-۲۰۱۹) کے ہمراہ ملاقات ہوئی ہے۔ بڑے شریف نفیس اور نیک نفس انسان ہیں۔ اپنے استاذ مولانا اقبال سہیل سے انہیں ایسا والہانہ لگاؤ اور عشق ہے کہ انہوں نے استاد کے تخلص کو اپنے نام کا جزو بنالیا اور مدۃ العمر اسی نام 'اسلم سہیل' سے شعر وشاعری سے کرتے رہے۔ ان کا ایک بڑا قیمتی شعری ذخیرہ منتشر حالت میں موجود ہے، البتہ اب تک ان کا مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوسکا ہے۔

اس مقالے میں سہیل اور کلام سہیل پر اولین تدوین وتجزیہ اور سوانح نگاری کا بنیادی کام کرنے والے ممتاز شاعر وادیب افتخار اعظمی اور مولوی حکیم سید مصلح الدین ثاقب کاظمی اور دیگر اقبال سہیل شناسوں کا اختصار سے ذکر کیا جاتا ہے:

افتخار اعظمی: افتخار اعظمی (۱۹۳۲-۱۹۹۴ء) مولانا اقبال احمد سہیل کے شاگرد اور اردو کے ممتاز ادیب ونقاد اور شاعر تھے۔ موضع جے گہاں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ وہ مولانا اقبال احمد سہیل کے رشتہ دار اور سمدھی عبدالغنی انصاری (م: اگست ۱۹۶۲ء) انکم ٹیکس کمشنر کے بھتیجے تھے۔ خود بھی ادیب وشاعر اور جدید علوم وفنون اورادبیات پر بڑی گہری اور باریک نگاہ والے ادیب اور اہل قلم تھے۔

انگریزی ادب کے ماہر تھے اور علم فلالوجی[۹] سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ دبستان شبلی میں علم فلالوجی پر سب سے گہری نگاہ تلمیذ شبلی اور دارالمصنّفین کے سابق رفیق مولانا ابوالجلال ندوی (۱۸۹۴-۱۹۸۴ء) رکھتے تھے۔ افتخار اعظمی دبستان شبلی کے دوسرے فرد تھے جنہیں علم فلالوجی سے گہرا شغف تھا، گویا ان کی شخصیت میں اجتماع ضدین تھا۔ ان دونوں علوم کا ان کی ذات میں یکجا ہونا واقعتاً ایک اہم بات تھی۔ افتخار اعظمی اور بھی متعدد خصوصیات کے حامل ادیب وشاعر تھے۔ وہ ایک نہایت عمدہ غزل گو، نظم نگار اور بڑے مقرر وخطیب بھی تھے۔ وہ جب تقریر کرتے تھے تو مجمع پر چھا جاتے تھے۔

پھر ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ لکھنؤ کا مرکز اردو جہاں گیر آباد پیلس چھوڑ کر انہوں نے لندن کا رخ کیا اور بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں بھی انہوں نے اپنے طور پر اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔ ۴ اپریل ۱۹۹۴ء کو اردو کے اس شاعر وادیب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور لندن ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

تابش سہیل اور ارمغان حرم: افتخار اعظمی مرحوم کی غزلوں کے اشعار ماہنامہ نئی نسلیں لکھنؤ کے مختلف شماروں سے نقل کئے ہیں لیکن ان کا قابل ذکر کارنامہ مولانا اقبال احمد خاں سہیل کی غزلوں کے مجموعہ 'تابش سہیل' اور نعتوں کے مجموعہ 'ارمغان حرم' کی ترتیب وتدوین اور طبع واشاعت ہے۔ سہیل شناسی میں یہ ان کی بڑی اہم کاوش ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

'تابش سہیل' مرکز ادب جہاں گیر آباد لکھنؤ سے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار افتخار اعظمی کی ترتیب وتدوین سے شائع ہوا اور نہایت مقبول ہوا۔ سہیل شناسی کے حوالے سے افتخار اعظمی کا دوسرا تدوینی کارنامہ 'ارمغان حرم' کی ترتیب وتدوین اور طبع واشاعت ہے۔ 'ارمغان حرم' اقبال سہیل مرحوم کی نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی مرکز ادب جہاں گیر آباد پیلس لکھنو ہی سے ۱۹۶۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ دونوں مجموعے سہیل صاحب کی شاعری کے بہترین نمونوں سے مزین ہیں اور ان دونوں کی اشاعت کا افتخار، افتخار اعظمی کو حاصل ہے۔ ان مجموعوں میں افتخار اعظمی نے مقدمہ، پیش لفظ کے علاوہ حیات سہیل اور دیگر اہل قلم کی نگارشات علامہ سہیل مرحوم کے

---

[۹] فلالوجی Philology یعنی علم لسانیات، جس کے تحت کسی زبان کی تاریخ، ترکیب اور اس پر دوسری زبانوں کی تاثیر سے بحث کی جاتی ہے (مدیر)۔

فکر و فن سے متعلق یکجا کی ہیں اور دونوں مجموعوں میں مرحوم کا خاصا ذکر موجود ہے۔

ذکر سہیل: اب اسے ہماری بے حسی کہا جائے یا کچھ اور کہ سوائے کلیات سہیل کے سہیل مرحوم کا کوئی مجموعہ نظم و نثر اب تک دوبارہ نہیں شائع ہوا۔ نہ تابش سہیل اور ارمغان حرم اور نہ افکار سہیل۔ بڑی محنت سے افتخار اعظمی نے 'ذکر سہیل' لکھا ہے جو ستمبر ۱۹۵۶ء کے "اردو ادب" علی گڑھ میں ایک طویل مقالے کی صورت میں چھپا ہے مگر وہ اصلاً ایک مکمل کتاب ہے۔ یہاں اختصار سے اس کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

> اس میں پہلے پس منظر کے طور پر سہیل صاحب کے خانوادے اور ان کے وطن اور جائے پیدائش وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی میں ان کی سیرت و شخصیت کا بھی بیان ہے، پھر ان کی شاعری کا ذکر ہے اور ان کے اساتذہ و معاصرین نے ان کے کلام بالخصوص قصائد و مراثی وغیرہ کی شبلی اور دوسرے ارباب علم و کمال نے تحسین و ستائش کی ہے، اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قصائد کے بعد ان کی غزلیہ شاعری اور اس میں اہل علم و نظر اور صاحب شعر و ادب کے تاثرات کو بھی افتخار اعظمی صاحب نے تسلسل سے نقل کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے۔

افتخار اعظمی نے سہیل صاحب کی بدیہہ گوئی کے ذکر پر مشتمل ان کا یہ مشہور واقعہ، جو سہیل مرحوم کے اور تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے، درج کیا ہے:

> سہیل کے نزدیک غالب، سعدی اور عرفی وغیرہ کی صف میں آتے ہیں۔ ذوق سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ خواجہ امیر احمد انصاری پانی پتی، جو ذوق کے بڑے شیدائی تھے، بلیا میں ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر عبدالغنی انصاری صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ سہیل کا بھی وہیں قیام تھا۔ خواجہ احمد انصاری اپنے ساتھ ذوق کا دیوان لائے تھے۔ سہیل نے کہا: "آزاد نے انتخاب اچھا نہیں کیا۔" خواجہ صاحب بولے: "آپ کو اس کا حق حاصل نہیں ہے، کیا آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ میں ذوق کی کوئی غزل منتخب کروں اور آپ ابھی اس کا جواب لکھ سکیں؟" سہیل مرحوم آمادہ ہو گئے۔ خواجہ امیر احمد نے ایک غزل منتخب کی، جس کا مطلع یہ ہے:
>
> الٰہی! کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل کشتنی ہے
> کہ آج کوچے میں اس کے شور بأیّ ذنبٍ قتلتَنی ہے

سہیل مرحوم نے اسی وقت فی البدیہہ ذوق کی اس غزل کا جواب لکھا، چند چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حریم دل میں وہ حسن مطلق جو بر سر جلوہ افگنی ہے
تو محرمان وصال کے لب پہ ٰہذہ ما وعدتنی ہے سہیلؔ
نہ کیوں ہو آنکھوں کو جائے ابرو کہ اوج فیض فروتنی ہے
ہوا تواضع سے جب خمیدہ بڑھی مہ نو کی روشنی ہے سہیلؔ
زمیں پہ نور قمر کے گرنے سے صاف اظہار روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر ان کا فروغ ان کی فروتنی ہے ذوقؔ
دوروزہ رفعت پہ ناز مت کر کہ بحر ہستی کے جزر و مد میں
یہ گنبد چرخ بھی کسی دن حباب آشا شکستنی ہے سہیلؔ

سہیل کی یہ غزل ان کی مہارت فن، ان کے قدرت کلام اور ان کی بے پناہ بدیہہ گوئی کی مثال ہے۔ پھر بھی اقبال سہیل کو اس بات کا اعتراف تھا کہ اگر ذوق کی یہ غزل:

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

منتخب کی جاتی تو میں شاید قیامت تک جواب نہ لکھ سکتا۔[۱۰]

ناچیز نے ایک مقالہ ''اقبال سہیل کی غالب شناسی'' کے عنوان سے عرصہ ہوا لکھا تھا جو راقم کے مجموعہ مضامین ''عکس واثر'' میں شامل ہے۔ اس میں اقبال سہیل کی غالب (۱۷۹۷- ۱۸۶۹ء) شناسی اور غالب سے بڑھی ہوئی عقیدت اور فکر و فن کے لحاظ سے غالب کو ذوق (۱۷۹۰- ۱۸۵۴) پر فوقیت دینے کا ذکر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ سہیل مرحوم نے ذوق سے بڑا فن کار مرزا غالب کو ثابت کیا ہے۔ ''ذکر سہیل'' میں مذکورہ بالا فی البدیہہ غزل کہنے کے ذکر کے بعد میر تقی میر (۱۷۲۳-۱۸۱۰ء) اور غالب کا موازنہ ہے اور افتخار اعظمی نے اس موازنہ سے سہیل کے نزدیک غالب کی فکری و فنی بلندی ثابت کی ہے۔ اشعار سے اس کی متعدد مثالیں بھی درج کی ہیں۔ علاوہ بریں متعدد شعرائے اردو سے موازنہ کیا ہے۔ شبلی و حالی اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شبلی کی شاعرانہ حیثیت ان (سہیل) کے نزدیک بہت بلند ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ''حالی کے یہاں تو کہیں کہیں پھیکا پن آجاتا ہے لیکن شبلی لطافت سخن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے''۔

---

[۱۰] ذکر سہیل، اردو ادب نمبر ۲، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۶۴-۶۵

غالب کے بارے میں ان کی یہ رائے نہایت صائب تھی کہ انہوں نے شعرائے فارسی سے اخذ واستفادہ ضرور کیا ہے، لیکن تغیر اور اضافے سے اپنے اشعار کو بلند تر بنا دیا ہے۔[۱۱]

افتخار اعظمی نے مولانا سہیل مرحوم کا متعدد شعرائے فارسی سے موازنہ کیا ہے جو سہیل صاحب کے گنجینۂ تحقیق پر نقد و تبصرے مطبوعے، ماہنامہ معارف سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد غزل گوئی کے سلسلے میں سہیل صاحب کے آرا و خیالات نقل کئے ہیں۔ اسی میں شاعری کے افادی اور غیر افادی پہلوؤں پر بھی سہیل صاحب کی آراء نقل کی گئی ہیں۔ یہی نہیں قدرے تفصیل سے سہیل صاحب کی شاعری کے ایک ایک پہلو اور ان کی ایک ایک خوبی بیان کی گئی ہے اور ان کے اشعار و کلیات سے متعدد مثالیں بھی فراہم کی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا اقبال سہیل کا افتخار اعظمی نے بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی سیاسی فکر اور تقسیم ہند، جس کے وہ شدید مخالف تھے، سے متعلق نظریات بھی پیش کئے ہیں اور دوسرے تمام ملی مسائل اور ان کے بارے میں سہیل صاحب کی آرا نقل کی گئی ہیں۔

ان کی نعتیہ شاعری، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (۵۷۱-۶۳۲ء) سے ان کی بے پناہ عقیدت و شیفتگی کے جذبات و احساسات پر مبنی اشعار نقل کر کے اس کی صراحت کی گئی ہے۔ ذکر سہیل اگرچہ ایک مقالے کی صورت میں مجلہ "اردو ادب" میں شائع ہوا تھا، تاہم اس کی حیثیت ایک مکمل کتاب کی ہے۔ اگر اس کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے تو زیر نظر مقالہ خود ایک کتاب بن جائے گا۔ ضرورت ہے کہ "ذکر سہیل" کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، اس لئے کہ افتخار اعظمی نے دیدہ و شنیدہ دونوں باتیں نہایت شگفتہ انداز میں اپنے مقالے میں لکھی ہیں۔ آخر میں ان کی فات اور ان کے ماتم کا ذکر ہے:

سہیل کے ساتھ ساتھ ذہانت، فطانت، خوش طبعی، ظرافت، بذلہ سنجی اور رسم خلوص و محبت اٹھ گئی۔ وفات سے چند ماہ پیش تر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا: "چند دنوں میں علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ میرے آٹو گراف میں کچھ ہدایتیں لکھ دیجئے"۔ کہنے لگے: "میرے پاس ہدایتیں کیا ہیں، لاؤ ایک شعر لکھ دوں، اس شعر میں میری زندگی کی صحیح تصویر چھپی ہوئی ہے۔ شاید یہ شعر تمہیں جینے کا سلیقہ سکھا سکے۔

---

[۱۱] ذکر سہیل ص ۶۵

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال
راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر[۱۲]

افتخار اعظمی لکھنؤ میں جہاں گیر آباد پیلس کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ اسی میں مرکز ادب قائم کر رکھا تھا۔ علامہ سہیل کے دونوں مجموعے اسی مرکز ادب سے شائع ہوئے۔ مولانا اقبال سہیل پر لکھے گئے مضامین اور وفیاتی مضامین کو بھی ان مجموعوں میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سہیل مرحوم پر جو منظومات منظر عام پر آئیں اور جن میں بعض افکار سہیل میں شامل ہیں ان میں بعض اضافوں کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

مولانا اقبال سہیل اردو و فارسی دونوں زبانوں میں داد سخن دیتے تھے اور وہ ان دونوں میں اپنے عہد میں عدیم النظیر قرار دیے جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جس صنف سخن میں داد دی اسے اوج ثریا تک پہنچا دیا ہے۔ معاصر شعرا بالخصوص نقادوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں کا کوئی جواب نہیں۔ قصیدہ نگاری اور نعت نگاری اور خاص طور سے ان کا نعتیہ قصیدہ 'موج کوثر' پورے نعتیہ سرمایہ میں نہایت حسین اور گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نعت نگاری کی بھی اردو کے بلند پایہ ادیبوں اور نقادوں نے تحسین وستائش کی ہے۔

حکیم سید مصلح الدین ثاقب کاظمی: دوسرے سہیل شناس مولانا حکیم سید مصلح الدین ثاقب کاظمی (۱۴-۱۹۱۳-۱۹۷۳) تھے۔ یہ اعظم گڑھ کے موضع کوٹھیا معافی (عطیہ شاہان اودھ) نزد فتح پور (تال رتوے) تحصیل گھوسی کے رہنے والے تھے۔ اعظم گڑھ شہر میں محلہ پہاڑ پور میں آبسے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اردو، فارسی، حفظ قرآن گھر پر ہوئی۔ عربی کی تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند گئے اور فضیلت کی۔ جدید تعلیم کا شوق لکھنو یونیورسٹی، الٰہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لے گیا، جہاں سے اردو، فارسی، انگریزی اور طب کے متعدد امتحانات پاس کئے۔ ان میں منشی، مولوی، عالم، فاضل اور انگریزی کی بھی بعض اسناد شامل ہیں۔ طب کی تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ہاؤس جاب البتہ گورکھپور میں حکیم

---

[۱۲] ذکر سہیل، مشمولہ اردو ادب، علی گڑھ، شمارے ۲، ص: ۱۲۴

وجیہ اللہ مرحوم کے مطب پر کیا۔

تکمیل کے بعد وطن کوٹھیا معافی میں مطب قائم کیا۔ درمیان میں کچھ دنوں علی گڑھ کے حکیم اجمل خان طبیہ کالج میں خطاط کے عہدہ پر فائز رہے۔ یہاں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک وہ شعبۂ ریسرچ میں خطاطی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہاں سے سبک دوش ہوکر وطن اعظم گڑھ آگئے اور اپنا مطب کوٹھیا معافی سے اعظم گڑھ شہر کے علاقہ پہاڑ پور میں منتقل کیا اور میدان طب میں عوام وخواص کی بڑی خدمت انجام دی۔ اپنے عہد میں ان کے دواخانے کا شمار اعظم گڑھ کے بڑے دواخانوں میں ہوتا تھا۔ حاجی افضال اللہ قادری نے ان کا نام اپنی کتاب 'تاریخ اعظم گڑھ' میں مشہور اطبائے اعظم گڑھ میں لکھا ہے۔

حکیم مصلح الدین ثاقب کاظمی مارچ ۱۹۷۳ء میں بیمار ہوئے اور ۷ جون ۱۹۷۳ء کو انتقال کیا۔ اعظم گڑھ میں آسودۂ خاک ہیں۔ حکیم اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں تعزیتی جلسہ ہوا اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔

سید مصلح الدین ثاقب کاظمی مرحوم بڑے اعلی پایہ کے عالم وفاضل اور شاعر وادیب تھے۔ تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق تھا۔ کئی طبی کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں۔ ان کے علاوہ درود اعلیٰ (غیر منقوط) کا ترجمہ بھی شائع کیا۔ شاعری کا شوق تھا اور مشاعروں میں بھی شریک ہوکر داد سخن دیتے تھے۔ منظوم "تجلیات رحمت عالم" ان کا لاجواب نعتیہ مجموعہ ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں حمد اور دوسرے حصہ میں نعتیں ہیں۔ اس کا انتساب بھی بڑا دلچسپ ہے۔ پہلا حمدیہ حصہ والد کے نام اور دوسرا نعتیہ حصہ والدہ کے نام ہے۔ اس پر ناظم دارالمصنّفین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (۱۹۰۴-۱۹۷۴ء) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کی تقریظات شامل ہیں۔ اسے ان کے برادر خورد سید علاء الدین کاظمی جو ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر دارالمصنّفین کے منصرم دفتر ہو گئے تھے، نے شائع کرایا۔ مکتبہ دارالمصنّفین میں یہ مجموعہ دستیاب ہے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے:

کروں جرأت حمد اس منہ سے کیوں کر
جو منہ بن چکا ہے معاصی کا مصدر

ان دونوں برادران کا دارالمصنّفین سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ بڑے بھائی حکیم سید مصلح الدین

ثاقب کاظمی کے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبد الرحمن (۱۹۱۱ - ۱۹۸۶ء) اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی (۱۹۳۶-۲۰۰۸ء) مرحوم سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ ہر ہفتہ احباب سے ملاقات ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ وہ پابندی سے دارالمصنّفین آکر ملاقات کرتے تھے۔ چھوٹے بھائی سید علاء الدین کاظمی، جن کا نام اوپر آچکا ہے، دارالمصنّفین کے دفتر میں ملازم تھے اور کئی برس تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

سہیل تاباں: سید مصلح الدین ثاقب کاظمی مرحوم اقبال احمد سہیل کے بڑے عقیدت کیش تھے بلکہ ان کے درمیان بڑے عقیدت مندانہ مراسم تھے۔ ان سے وہ اصلاح سخن بھی لیتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں علامہ سہیل کی وفات کے بعد ان کی سوانح حیات مرتب کرنے کا انھوں نے بھی عزم وتہیہ کیا اور ماہنامہ ادیب علی گڑھ میں جس کے مدیر ڈاکٹر ابن فرید (۱۹۲۵- ۲۰۰۳ء) اور معاون مدیر پروفیسر کبیر احمد جائسی (۱۹۳۴- ۲۰۱۳ء) تھے، بالاقساط ''سہیل تاباں'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا، جس کا سلسلہ ۶ قسطوں کے بعد رک گیا۔ مگر کیوں رک گیا یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ سہیل مرحوم کی حیات و خدمات کا ایک مختصر، جامع مگر نامکمل مرقع ہے۔ اس میں سوانح نگار نے، جو خود ایک کہنہ مشق شاعر وادیب اور اہل قلم تھے اور نعت نگاری سے ان کو اپنے استاذ مولانا سہیل ہی کی طرح گہرا شغف تھا، ان کے حالات و سوانح اور شاعری کو موضوع تحقیق بنایا ہے۔ 'سہیل تاباں' کا آغاز کاظمی صاحب نے اقبال سہیل صاحب سے اپنی پہلی ملاقات اور اپنے ابتدائی ربط و تعلق اور ان کی شفقت و محبت کی داستان سے کیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کے ۱۹۵۲ء کے ایک مشاعرے کی صدارت کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> صدر مجلس کے متعلق آنکھیں عموماً اس کی عادی ہیں کہ وہ بہت باضبط، پہنے اوڑھے، بناؤ سنگار کئے، بھاری بھر کم ہو کر اپنی نشست کے ٹھیک مرکز پر بارعب و پر جلال انداز میں بیٹھا ہوا پایا جائے، کیا مجال کہ آداب مجلس کے خلاف کوئی ایک لفظ تو اس سے پوچھ سکے، یا کیا امکان کہ اپنے منصب سے ذرا فروتر ہو کر وہ خود کسی سے ہم کلام تو ہولے؟ مگر واہ رے سادگی! جن آنکھوں نے دیکھا ہے وہ یقین کریں گی کہ موصوف کی ذات گرامی ان الفاظ صدارت وغیرہ سے کہیں بالاتر تھی۔ ان الفاظ سے نہ انہیں ظاہری اعزاز حاصل ہوتا نہ ان پر کوئی باطنی پابندی عائد ہوتی۔ ہاں لفظ صدارت خود جامۂ صدارت پہن کر لوگوں کے لئے فریب وش و نظر بن جاتا ان کے ہاں نہ احساس صدارت نہ اظہار صدارت، نہ رکھ رکھاؤ۔

”صدر ہر جا کہ بہ نشیند صدر ہست“ کے مشہور مقولہ کے مطابق جہاں چاہئے انہیں دیکھ لیجئے اور جہاں جی چاہے ان سے ہم کلام ہولیجئے، بلکہ ان کا کلام بھی سن لیجئے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ سجے سجائے اور پھولوں سے لدے ہوئے پرنور ڈائس پر برات کے ایک الھڑ (مگر سن رسیدہ) دولہا کی طرح بے تکلف لیٹے ہوئے اپنے لمبے لمبے قصیدے، پرانے قصیدے بے تکان سنائے چلے جا رہے ہیں۔[۱۳]

اس کے بعد کاظمی صاحب نے سہیل صاحب کے بے مثال حافظے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ بہ خوشی نہیں بہ جبر کہنا پڑتا ہے کہ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر اقبال سہیل صاحب کے خاندانی احوال، ان کی تعلیم و تربیت اور اساتذہ، وغیرہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے اور سہیل صاحب کے بارے میں مؤلف کاظمی صاحب نے اپنے آراء و خیالات بھی پیش کئے ہیں اور لکھا ہے کہ:

علامہ شبلی کو تو بجائے خود چھوڑئے سہیل کے فارسی کلام کے سامنے حقیقت یہ ہے کہ عارف شیرازی سے لے کر خاقانی، نظیری، عرفی اور صائب تک کی ارواح قدسیہ داد سخن دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے حق یہ ہے کہ اگر صحیح طور پر ایک فرد میں آپ تمام اصناف سخن کا نکھرا ہوا حسن و کمال دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو گلزار سہیل کی گلگشت کا مشورہ دیں گے۔ اس میں قدم رکھتے ہی رنگارنگ تفریحی مناظر آپ کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کر لیں گے کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ تمام دوسرے گلزاروں کی تفریح سے اپنے آپ کو بے نیاز محسوس فرمائیں گے۔ کہیں غزلوں کی سدابہار پھولوں کی حسین کیاریاں جاذب نظر ہوں گی تو کسی جگہ سچی عقیدت کے آئینہ دار مداحی رسول مقبولؐ کے ایمان افروز ترانے اور مناقب صحابہؓ کرام کے جان پرور قصائد دیکھ کر آپ کے دل کی کلی کھل جائے گی، کہیں شیر و شکر میں سموئے ہوئے سیاسی نشتر دل و جگر میں میٹھی چٹکیاں لینے لگیں گے تو کسی موقعہ پر روحانی تغزل کے جگمگاتے ہوئے جواہر پارے آپ کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور

---

[۱۳] ادیب علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۲ء، ص ۳۳

بخشیں گے۔[۱۴]

"سہیل تاباں" میں اختصار سے علامہ اقبال سہیل کی غزل گوئی اور نعتیہ شاعری کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اپنی مخصوص نثر میں۔ ثاقب کاظمی صاحب لکھتے ہیں:

سہیل کی شاعری کا ایک خاص کمال غزلوں میں اگر صرف داستان حسن و عشق بیان کرنا ہو تو بہتیرے داستان گو مل جائیں گے اور حلاوت و شوخی و عشق کی نزاکت و تلخی کے امتزاج سے ہر ہوسناک اپنے کلام میں یک گونہ چاشنی پیدا کر ہی لے گا۔ سہیل کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے وادیٔ تغزل کی نازک و لطیف رومانی کیاریوں میں میدان سیاست کے سنگریزے اس دیدہ زیب ڈھنگ سے بکھیر دئے ہیں جس سے یہ سیاسی کانٹے موسم بہار کے شگفتہ پھولوں کی طرح دل فریب معلوم ہونے لگتے ہیں۔[۱۵]

یہاں کاظمی صاحب نے مولانا سہیل کی غزلوں پر اختصار سے قلم اٹھایا ہے اور آگے تفصیل سے لکھنے کا عندیہ ظاہر کیا ہے، مگر پھر اس کا موقع ہی نہیں آسکا۔ اس کے بعد سہیل صاحب کی نعتیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

موصوف کے چمنستان تغزل کی خوبیاں پیش کرنے سے پہلے ان کے سجائے ہوئے گلزار نبوت سے چند پھول چن کر آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، آپ کہیں گے، شاعر کے خلوص و عقیدت کی پختگی نے معراج جیسے پیچیدہ مسئلہ کو کس طرح سہل ممتنع میں ڈھالا ہے؟

میری گذارش کے مطابق پہلے قصیدہ نعتیہ کے تشبیہیہ اشعار پر غور فرمائیں، ارشاد ہے:

کرے تار شعاعی لاکھ اپنی سعیٔ امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی
وہی سمجھیں گے جو واقف ہیں اسرار محبت سے
کہ یکساں جاں گسل ہے ذوقِ وصل و درد ہجرانی
ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشت ایمن کا
قیامت ہے قیامت جلوۂ جاناں کی عریانی[۱۶]

---

[۱۴] ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۲ء، ص: ۳۷

[۱۵] ماخذ سابق

[۱۶] ادیب، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۲ء، ص ۳۸

ثاقب کاظمی نے نعتیہ قصیدے کے متنوع اشعار نقل کر کے سہیل مرحوم کی نعت نگاری میں ان کی ہمہ دانی دکھلائی ہے۔ اسی بحث میں معراج کے متعلق سہیل کے صحیح عقیدے کی تفصیل پیش کی ہے۔ چونکہ نعتیہ قصیدے کے تمام اہم پہلوؤں کو سہیل مرحوم نے منظوم کیا ہے اس لئے اس کی تفصیلات بھی درج کی گئی ہیں، پھر سدرۃ المنتہیٰ سے آگے کے حالات کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں بطور دلیل کاظمی صاحب نے کثرت سے اشعار نقل کئے ہیں۔ اس پہلی قسط کے آخر میں موج کوثر سے انتخاب کیا ہے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

لطف اور خوبی یہ ہے کہ اس نظم میں ذات رسول و ذاتیات نبیؐ کے علاوہ تمام مختصات ومتعلقات نبوتؐ بھی فراہم کر دئے گئے ہیں، مثلاً خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم، ان کے مراتب و مناقب، اسلام کے حق میں ان کی بے نظیر قربانیاں اور خدمات، پھر پنجتن پاک کے اعلیٰ مدارج، ان کی صفات و خصوصیات، پھر ازواج مطہرات، ان کی طہارت و عفت اور تطہیر قرآن کا ثبوت، اس کے عشرۂ مبشرہ کے اسمائے گرامی اور مہاجرین و انصار و اعوان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے اسمائے مبارک و درجات۔ اس لئے اس میں شک نہیں کہ نظم کی شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر ان متبرک ناموں کے اضافہ و اجتماع نے اس نعت کو نور علیٰ نور بنا دیا ہے۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد ذوق سلیم بول اٹھتا ہے کہ یہ نعت اپنے مخلصانہ جذبات کی برکت سے درحقیقت مقبول ہوگی۔ اور رحمت الٰہی سے امید واثق بندھ جاتی ہے کہ یہی نعت شاعر کے لئے وجہ نجات و حیلہ مغفرت بھی ہو سکتی ہے۔[۱۷]

اس کے بعد جونپور کے محمد حسن کالج میگزین میں شامل کلام کی ترتیب کے مطابق منظومات فتح سمرنا وغیرہ کا ذکر اور اس کے متعدد اشعار درج کئے گئے ہیں، پھر قومی، ملی اور سیاسی نظموں اور غزلوں کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

حریت وطن کی دھن شاعر کے دل و دماغ پر اس طرح مستولی ہے کہ وہ اس غلامی کے قفس کو کسی نہ کسی قیمت پر ایک بار آزاد نشیمن کی شکل میں دیکھنے کے لئے بیتاب دکھائی دیتا ہے، خواہ اس کے بعد قفس کا انجام کچھ بھی ہو جائے۔ اسے یہ تسلیم ہے کہ اگرچہ کیا[۱۸] و صیاد نے

---

[۱۷] ماخذ سابق، ص ۴۱

[۱۸] فرمانروا، حاکم

اپنی طمع سازی سے قفس کو بظاہر ہر طرح آراستہ اور دیدہ زیب بنا دیا ہے، لیکن اس کے نزدیک چند تنکوں کا وہ آزاد نشیمن جو اپنے بال و پر سے آزادانہ ترتیب دے لیا جائے، اس خوب صورت قفس غلامی سے کہیں زیادہ باعزت اور راحت رساں ہے۔[(۱۹)]

علامہ شبلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی دانشوروں کو عالم اسلام سے محبت کرنا سکھایا، چناچہ مولانا ابوالکلام آزاد ہوں یا مولانا ظفر علی خاں، علی برادران ہوں یا مولانا سید سلیمان ندوی، ان سب کو عالم اسلام کے مسائل و معاملات سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ ان کو یہ باور کرایا کہ یہ ہمارا ہی ورثہ ہیں۔ علامہ شبلی کا مختصر سا اردو دیوان ان جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے۔ علامہ سہیل بھی اپنے استاد کے اس نقطۂ نظر سے متاثر ہوئے اور اپنی شاعری میں ان جذبات کی عکاسی کی۔ ثاقب کاظمی صاحب نے اس سلسلے کی کئی دوسری نظموں اور ان کے مفاہیم و مطالب کی توضیح و تصریح کی ہے اور اس کی متعدد مثالیں بھی نقل کی ہیں۔ چنانچہ ان کلیات میں بھی آزادی اور وطن کے جاں بازوں پر متعدد نظمیں شامل ہیں۔ کاظمی صاحب نے ان کا بھی تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے اور تسلسل سے منظومات کا ذکر کر کے ان کے معانی اور تاریخی حیثیت کی توضیح کی ہے۔

سہیل تاباں کی پانچویں اور چھٹی قسط بھی اسی سلسلہ کی نظموں کی تشریح پر مشتمل ہیں اور ان کی مثالوں میں نظموں کے منتخب اشعار نقل کئے گئے ہیں اور اس شعر پر اس سلسلہ مضامین کا خاتمہ ہوا ہے:

اگر راجے مہاراجے بھی حامی ہیں رعایا کے
تو بے شک بجلیاں بھی پاسباں ہیں آشیانوں کی

'سہیل تاباں' کا یہ طویل تعارف اس لئے کرایا گیا کہ علامہ سہیل کے بارے میں یہ اس شخص کی تحریر ہے جس نے اقبال سہیل مرحوم کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ ان کا محب و شیدائی بھی تھا اور ان سے اصلاح سخن بھی لیتا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ سہیل مرحوم پر قلم اٹھانے والے کسی اہل قلم نے 'سہیل تاباں' کا ذکر اب تک نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد کسی ایسے اہل قلم نے جس نے مولانا سہیل کو دیکھا ہو اور ان سے ان کا کلام

---

(۱۹) ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۴۸

سنا ہو، ان میں سے کسی نے پختہ ارادے کے تحت ان کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد میں جن لوگوں نے بھی قلم اٹھایا ان کے پیش نظر مذکورہ بالا ماخذ ہی تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری پر کوئی ایسا قابل ذکر مطالعہ و مقالہ سامنے نہیں آسکا جو اس دور میں اہل علم کے درمیان لائق غور و فکر اور قابل لحاظ رہا ہو اور سہیل مرحوم کے شایان شان بھی ہو۔

بہرکیف ان دونوں سہیل شناسوں نے سہیل مرحوم کے لئے جو کچھ کیا وہ قابل ذکر ہے اور اب ان سہیل شناسوں پر بھی ادبی کام ہونا چاہئے۔ کم از کم ان کا تذکرہ ہی سہی سلیقے سے لکھا جانا چاہئے۔

کلیات سہیل : سنہ ۱۹۸۸ء میں مولانا اقبال احمد سہیل کے لائق نواسے عارف رفیع نے 'کلیات سہیل' مرتب کر کے شائع کیا۔ کلیات سہیل اب دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے دوبارہ شائع کر دیا ہے اور اس کے مکتبہ پر دستیاب ہے۔

'کلیات سہیل' کی اشاعت کے بعد سہیل شناسی کی رفتار کسی قدر تیز ضرور ہوئی اور ان کی بعض نظمیں، غزلیں اور مضامین رسائل و جرائد سے دستیاب ہوئے لیکن بڑے شعرا کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ کلیات یا دیوان کی ترتیب و اشاعت کے بعد ان کی تخلیقات دستیاب ہوتی رہی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ان کی مقبولیت کی ایک دلیل ہے، چنانچہ اس سلسلہ کی ایک نادر تحریر ڈاکٹر شباب الدین نے اور چند غیر مدون نظم و نثر راقم نے اپنی اپنی تحریروں میں شائع کی ہیں۔

انتخاب کلام سہیل: 'انتخاب کلام سہیل' ۱۹۸۹ء میں اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ یہ انتخاب مولانا ضیاء الدین اصلاحی (۱۹۳۶ - ۲۰۰۸ء) سابق ناظم دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے اردو اکادمی لکھنؤ کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس وقت پروفیسر محمود الٰہی (۱۹۳۰ - ۲۰۱۴) اترپردیش اردو اکادمی کے چیرمین تھے۔ 'انتخاب کلام اقبال سہیل' پروفیسر محمود الٰہی کا پیش لفظ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی تقدیم اور اقبال صاحب کی غزلوں اور نظموں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ مولانا مرحوم شعر و ادب کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے، وہ سہیل صاحب کی غزل گوئی پر اس سے پہلے ایک مفصل مقالہ لکھ چکے تھے، چنانچہ انتخاب بھی عمدہ کیا اور مقدمہ بھی بہت عمدہ اور معلومات افزا لکھا۔ اس میں اقبال سہیل مرحوم کے حالات اور کارناموں پر اختصار و جامعیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اقبال سہیل حیات اور شاعری: جہاں تک مجھے معلوم ہے علامہ اقبال احمد سہیل پر صرف ایک تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو ڈاکٹر منور انجم نے لکھا ہے جو ۱۹۹۵ء میں مئو سے مقالہ نگار نے

شائع کیا۔ یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے: سوانح و شخصیت، عہد وماحول اور مختلف ابواب میں قومی، ملی، فلسفیانہ، متصوفانہ، عشقیہ و نعتیہ شاعری پر ان کے کلام کی روشنی میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے محنت کی ہے اور موضوع کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس تحقیقی مقالہ کی اہمیت کے لئے اس قدر جاننا کافی ہے کہ یہ پروفیسر محمود الٰہی مرحوم کی زیر نگرانی لکھا گیا ہے۔

اقبال سہیل کا فن: ڈاکٹر منور انجم کی پی ایچ ڈی کے مقالہ کی اشاعت کے بارہ سال بعد مقالات کا ایک اور مجموعہ 'اقبال سہیل کا فن' کے عنوان سے پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی (پ: ۱۵ اپریل ۱۹۶۱ء) استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مرتب کیا جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں سوائے مرتب کے مقالے کے تمام مقالات ''افکار سہیل'' اور ''ارمغان حرم'' وغیرہ کے حصۂ نثر سے نقل کئے گئے ہیں۔ اقبال سہیل کے وہ مقالات جو افکار سہیل میں شامل ہیں مثلاً شبلی کی جامعیت اور مکاتیب شبلی وغیرہ بھی نقل کئے گئے ہیں، بحیثیت مجموعی یہ ایک عمدہ مجموعہ ہے، اور افادیت سے خالی نہیں۔

عالمی رنگ ادب، کراچی (علامہ اقبال سہیل نمبر): رسائل و جرائد میں علامہ اقبال سہیل کی شخصیت، شاعری بالخصوص نعت نگاری پر متعدد مضامین و مقالات اور نقد و تبصرے لکھے گئے مگر اب تک کسی رسالہ نے ان پر خصوصی شمارہ شائع نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ۲۰۱۱ء میں کتابی سلسلہ ''عالمی رنگ ادب'' کراچی نے پہلا خصوصی شمارہ ''علامہ اقبال سہیل نمبر'' شائع کیا۔

عالمی رنگ ادب کے لائق مدیر نے اس خصوصی اشاعت کے اسباب و علل کی اداریہ میں وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> جناب علامہ اقبال سہیل کے کلام سے تمام بڑے شاعر، ادیب و نقاد متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے، ان کے فن کا لوہا سبھی نے مانا ہے اور ان کے کمال کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کے ہم عصر اہل قلم نے ان کے فن کی گواہی بھی دی ہے۔ ان کے متعدد اشعار زبان زد عام ہیں اور ضرب الامثال کی حیثیت سے گردش کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال سہیل خود تو پاکستان نہیں آئے مگر ان کے مشہور و معروف اشعار آج بھی ان کی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ان کا لہجہ واسلوب غزل، حمد و نعت اور منقبت میں یکساں ہے، 'موج کوثر' ان کی طویل نعتیہ نظم بے مثال ولاجواب ہے۔

ایسے کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر پر تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہو سکا، جس کی کچھ وجوہات رہی ہوں گی، مگر وقت اور قارئین سب سے اچھے اور بڑے نقاد ہوتے ہیں۔ آج قارئین شعر و سخن ان کے اشعار کے ارتقاء اور سفر سے واقف ہیں، اس لئے نہ صرف ان کا کلام بلکہ ان کا نام بھی ادب اور اہل ادب کے دلوں میں زندہ ہے اور لوگ ان کا نام بڑے عزت و احترام سے لیتے ہیں، کسی شاعر کے لئے یہ اعزاز کم نہیں ہوتا کہ مرنے کے بعد بھی لوگ ان کو یاد کریں اور ان کے کلام سے استفادہ بھی کریں۔ لہٰذا ایسے شاعر کے لئے 'عالمی رنگ ادب' نے اس خصوصی شمارے کا اجرا کر کے ایک وقیع کام کیا ہے اور ان لوگوں کو دعوت تحقیق دی ہے جو ریسرچ کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ سہیل کی شخصیت ادبی حیثیت کی حامل ہے، ان کے فن پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جانا چاہئے تاکہ ان کا کلام اور ادبی کارنامے آ سکیں اور حریصان علم کی تشنگی کم ہو سکے۔[۲۰]

ہندوستان میں علامہ سہیل پر ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا چکا ہے، شاید مدیر مجلہ عالمی رنگ ادب کراچی کو اس کا علم نہیں تھا، جس کا ذکر ہم گذشتہ اوراق میں کر چکے ہیں، البتہ پاکستان میں اس شمارۂ خاص کے علاوہ کوئی اور علمی و ادبی کام اب تک سہیل مرحوم پر نہیں ہو سکا ہے۔

"عالمی رنگ ادب" کی اس خصوصی اشاعت کے مشمولات تین حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ غیر مطبوعہ مضامین پر مشتمل ہے، جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ علامہ سہیل	فضا اعظمی
۲۔ علامہ اقبال سہیل بحیثیت غزل گو	ڈاکٹر اختر ہاشمی
۳۔ علامہ اقبال سہیل: ایک خوش فکر شاعر	جاوید رسول جوہر
۴۔ لفظوں کا جادو گر: علامہ اقبال سہیل	جاوید رسول جوہر
۵۔ علامہ اقبال سہیل کی منقبت نگاری	شاعر علی شاعر
۶۔ موج کوثر: طویل نعتیہ نظم	شاعر علی شاعر
۷۔ علامہ اقبال سہیل بحیثیت نظم گو	شاعر علی شاعر

اس کے بعد ۶ مطبوعہ مضامین شامل ہیں۔ پھر مشاہیر مولانا حبیب الرحمن شروانی، خواجہ کمال الدین، نیاز فتح پوری اور مسز سروجنی نائیڈو کی آرا اور اعتراف پر مبنی تحریریں شامل کی گئی

[۲۰] عالمی رنگ ادب، کراچی، ص: ۴

ہیں۔ اسی میں سہیل صاحب کے خط کو، جو مولانا اسلم جیراجپوری کے نام ہے اور جو اوپر نقل بھی کیا جاچکا ہے، مدیر نے شامل کیا ہے۔ تیسرے اور آخری حصہ میں 'ارمغان حرم' سے سہیل صاحب کا منتخب کلام نقل کیا ہے اور اس سے متعلق اہل علم کے مطبوعہ مضامین بھی شامل کئے ہیں۔ اس میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ اقبال سہیل میری نظر میں	شاہ معین الدین احمد ندوی
۲۔ وحید عصر	ابو علی اعظمی
۳۔ سہیل مرحوم	نیاز احمد صدیقی
۴۔ اقبال سہیل	علی جواد زیدی
۵۔ مولانا سہیل کی بدیہہ گوئی اور مزاح نگاری	محمد حنیف خاں
۶۔ حالات زندگی	حافظ عبد الحمید اعظمی
۷۔ مولانا اقبال سہیل کا نظریۂ حیات	رحم علی الہاشمی
۸۔ سہیل اور ان کا ماحول	افتخار اعظمی
۹۔ مشفق بزرگ، اچھا انسان	علی حماد عباسی

اس کے بعد مولوی حامد حسن قادری، وحشی کانپوری، یحییٰ اعظمی اور امجد علی غزنوی کی مطبوعہ منظومات شامل اشاعت کی گئی ہیں اور آخر میں کلیات سہیل سے ان کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک اہم اور قابل ذکر و مطالعہ و پیش کش ہے۔ اس سے علامہ اقبال سہیل کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔

دانش سہیل: علامہ اقبال سہیل کے اعزہ نے ڈاکٹر شباب الدین صاحب کی سربراہی میں شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ میں ۱۹، ۲۰ فروری ۲۰۱۷ء کو ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک کے متعدد اہل قلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔ ۲۰۱۸ء میں ان مقالات کو ڈاکٹر شباب الدین نے "دانش سہیل" کے نام سے شائع کیا۔ بلاشبہ یہ مجموعہ مقالات بڑے اہم اور وقیع مقالات پر مشتمل ہے۔ سہیل صاحب کے مطالعے پر اب تک جتنے بھی مجموعہ مقالات شائع ہوئے ہیں یہ ان سب میں اپنے مشمولات کے لحاظ سے منفرد اور نہایت معلومات افزا ہے۔

اقبال سہیل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ: اس کے بعد ایم فل کا ایک مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی کے شعبۂ اردو میں صدف پرویز نے لکھا، جس کا عنوان "اقبال سہیل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ" ہے۔ یہ مقالہ ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے اور دو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی نئی تحقیق و تحریر شامل نہیں ہے اور عموماً ایم فل کے لئے جس طرح کے مقالے لکھے جاتے ہیں، ویسا ہی یہ مقالہ ہے۔ البتہ اس کی اشاعت سے عددی لحاظ سے سہیل شناسی میں ضرور ایک اضافہ ہوا ہے۔

اقبال سہیل کے مضامین: ڈاکٹر ابو ارشد اعظمی نوجوان اہل قلم ہیں، اعظم گڑھ کے موضع چاندپٹی کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے "اقبال سہیل کے منتخب مضامین" کے نام سے دو جلدوں میں سہیل مرحوم کے مطبوعہ ادبی مضامین، نقد و تبصرے، تقریظات، تقدمے، مکاتیب اور خطبات کے مجموعہ افکار سہیل اور ان کے دوسرے مجموعہ ہائے کلام پر لکھے گئے، مقالات، مقدمے اور تقریظات وغیرہ نقل کر کے اسے منتخب مقالات کا نام دے دیا گیا ہے، بعض غیر متعلق مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں، اس انتخاب کی دوسری جلد راقم کی نظر سے گذری ہے، لیکن یہ اس لحاظ سے یہ ایک بہتر کوشش ہے کہ 'افکار سہیل' کے نایاب ہونے کی وجہ سے سہیل مرحوم کی فکر و نظر کے مطالعے میں اہل علم کو جو دشواری پیش آرہی تھی، اس کی اشاعت سے وہ دور ہو سکتی ہے۔ مطالعۂ سہیل میں یقیناً اس سے بڑی آسانی ہو گی۔

اقبال سہیل شخصیت اور فن: یہ ڈاکٹر عائشہ خان کی کتاب ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ افکار سہیل مرتبہ شوکت سلطان اور میجر علی حماد عباسی میں جو مضامین و مقالات سہیل صاحب پر شامل تھے یا جو انفرادی طور پر لکھے گئے تھے ان کو اس کتاب میں یکجا کیا گیا ہے۔ چند نئے مضامین بھی شامل ہیں جس سے اس کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ اقبال سہیل پر کام کرنے والوں کو اس میں یکجا مواد مل جائے گا۔

علامہ سہیل پر جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں بحیثیت مجموعی اس میں سے کسی نے بھی افکار سہیل سے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا ہے۔ وہ جس بلند فکر و نظر کے مالک تھے اور فکر و فن پر ان کی جس قدر گہری نظر تھی اس پر اگر کسی نے کچھ آگے بڑھ کر روشنی ڈالی ہے تو وہ افتخار اعظمی مرحوم تھے۔ بقیہ لکھنے والوں نے یا تو جمع و تدوین کا کام کیا ہے بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کر دیا ہے یا پھر اصل موضوعات یعنی شاعری میں ان کے بلند مقام و مرتبہ پر چبی چبائی باتیں ہی پیش کی ہیں۔

رفقائے دارالمصنّفین کی سہیل شناسی: مولانا اقبال سہیل علامہ شبلی کے چہیتے شاگرد تھے۔

شبلی شناسی میں ان کا بڑا اہم حصہ ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے حادثۂ پا پر متعدد قطعات و رباعیات کہیں اور وفات پر بڑا دلدوز مرثیہ لکھا۔ یہ تمام ادبی تخلیقات ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں متعدد علمی و تحقیقی مضامین لکھے، ان میں علامہ شبلی کی یاد میں، علامہ شبلی کی جامعیت، مکاتیب شبلی وغیرہ خاص قابل ذکر ہیں اور علاحدہ ذکر و جائزہ کے قابل ہیں۔ ان کی یادگار دارالمصنّفین اور اس کے ذرے ذرے سے انہیں بڑی انسیت تھی۔ اس کی ہر علمی و ادبی مجلس کا وہ حصہ رہتے تھے، جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی بھی ان کے بڑے مداح تھے۔ انہوں نے 'تابش سہیل' کے عنوان سے جو تحریر لکھی ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ غالباً، یہی سبب ہے کہ وہ تحریر متعدد مقامات پر نقل ہوئی ہے۔ کلیات سہیل کا سر آغاز بھی وہی تحریر ہے۔

۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو جب اقبال سہیل کا انتقال ہوا تو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنّفین و مدیر معارف نے پہلے معارف میں ان کا ماتم (وفیات) کیا، پھر سہیل مرحوم کی نعت و منقبت نگاری پر بڑا بسیط افروز مقالہ لکھا جو ان کے ادبی مضامین کے مجموعہ 'ادبی نقوش' مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۰ء میں شامل ہے۔ ان کا ایک اور مقالہ 'اقبال سہیل: میری نظر میں' بھی شائع ہوا ہے۔

دارالمصنّفین کے سابق ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ایک مفصل مقالہ 'اقبال سہیل کی غزل گوئی' پر لکھا ہے جو ان کے مجموعہ مقالات "چند ارباب کمال" میں شامل ہے۔ بعض ازاں "انتخاب سہیل" اردو اکادمی لکھنو کی خواہش پر مرتب کیا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی سابق رفیق دارالمصنّفین ایک صاحب طرز ادیب و نقاد ہیں۔ انہوں نے بھی سہیل صاحب کی عظمت پر ایک مفصل مقالہ لکھا ہے جو ان کے مجموعہ مقالات "بزم دانشوراں" میں شامل ہے اور اس لائق ہے کہ بار بار پڑھا کیا جائے۔

مرزا احسان احمد دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ انہوں نے نہایت عمدہ مقالہ سہیل کی شخصیت اور فکر و فن پر لکھا ہے، جو ان کے مجموعہ 'مقالات احسان' میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ رفقائے دارالمصنّفین کے ان مقالات کو اگر یکجا شائع کر دیا جائے تو اقبال سہیل مرحوم کی حیات و خدمات اور فکر و فن پر ایک نہایت عمدہ کتاب منظر عام پر آجائے گی اور اس سے سہیل شناسی میں بھی بلاشبہ بڑا اہم اضافہ ہوگا۔

”دعوت فکر و نظر“
مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی ایک فکر انگیز کتاب

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
zafarul.islam@gmail.com

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی (۱۳/ ستمبر ۱۹۶۰ء- ۱۶/ جنوری ۲۰۲۵ء) سے ناچیز راقم کی ذاتی ملاقاتیں کم رہی ہیں۔ مولانا سید محمد رابع ندویؒ (یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء- ۱۳/ اپریل ۲۰۲۳ء) کی حیات میں کسی کام سے لکھنؤ میں قیام کے دوران جب ان سے ملاقات کے لیے ندوۃ العلماء حاضری ہوتی اور بعد عصر مہمان خانہ میں حاضرِ خدمت ہوتا تو کبھی کبھار مولانا سید محمد جعفر حسنی ندویؒ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ چند برس قبل مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ (م ۱۶/ جنوری ۲۰۱۹ء) پر مضمون لکھنے کی تیاری کے دوران اُن کی بعض کتابوں پر ان کے صاحب زادے (مولانا سید جعفر حسنی ندویؒ) کے تحریر کردہ مقدمہ یا تعارفی کلمات سے استفادہ کا موقع ملا تو ان کی نگارشات سادہ زبان، مشکل الفاظ و پیچیدہ تراکیب سے پاک، سہل و دل نشیں اسلوبِ بیان اور تذکیری پیرایہ کا نمونہ نظر آئیں اور دل میں گھر کر گئیں۔ مولانا محمد فرمان ندوی کا مضمون نظر سے گذرا اور مرحوم کی علمی یادگاروں کے بارے میں پڑھا تو ان کے مجموعۂ مضامین ”دعوتِ فکر و نظر“ پر نظر رک گئی[1]، اور اسی کو منتخب کر لیا۔

درس و تدریس کی مصروفیات کے ساتھ مولانا سید جعفر حسنی ندویؒ عربی اور اردو مضمون نگاری سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کے علمی جوہر اور غور و فکر کے نتائج اس میدان میں خوب نمایاں ہوئے۔ مرحوم کی نگارشات کو مطالعہ کرنے والوں کا عام تاثر یہ ہے کہ وہ بہترین تحریری صلاحیتوں سے متصف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تحریری سرمایہ (کتب و مضامین) بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ انہیں قلم کی قوت و طاقت کا نہ صرف گہرا شعور تھا، بلکہ وہ مفید و تعمیری کاموں کے لیے اس کے استعمال کے (قولی و عملی دونوں طریقے سے) مبلّغ و محرک تھے۔ ان کی علمی

---

[1] محمد فرمان ندوی، ” اجالے اپنی یادوں کے......“، روزنامہ ”انقلاب“، ۱۷/ جنوری ۲۰۲۵ء

یادگاریں اس کی شاہد ہیں کہ انہوں نے اپنی قلمی توانائیاں اصلاحِ معاشرہ کے کاموں کے لیے وقف کر دی تھیں۔ واقعہ یہ کہ انہوں نے قلم کے ہتھیار کو خانگی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی (بالخصوص مسلمانوں کے حوالے سے) اندرونی خرابیوں و کمزوریوں کی نشان دہی اور قرآن وسنت رسول ﷺ کی روشنی میں ان سے نجات / حفاظت کی تدابیر واضح کرنے اور ان کی طرف توجہ دلانے کے لیے بخوبی استعمال کیا۔ اسی مقصد کے تحت ان کی تحریریں ملک کے معروف رسائل و اخبارات کی زینت بنتی رہیں۔ پیشِ نظر تالیف (دعوتِ فکر و نظر) انہی تحریروں کا ایک فکر انگیز منتخب مجموعہ ہے۔ اپنے مضامین میں انہوں نے معاشرت و معیشت اور حکومت کے تعلق سے جن خرابیوں و کمزوریوں کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی ہے، ان میں کچھ اہم یہ ہیں:
عملی زندگی میں قرآن و سنت سے دوری، روزمرہ زندگی کے معاملات میں شرعی قوانین کی جزوی پابندی یا اپنی پسند کے مطابق ان پر عمل آوری، قول وفعل میں عدمِ مطابقت کا بڑھتا ہوا رجحان، اخلاقی اقدار کے پاس ولحاظ کی کمی، مغربی تہذیب کی نقالی، بے حیائی و بے شرمی کی باتوں پر روک ٹوک کی کمی، مال وزر جمع کرنے کی بڑھتی ہوئی حرص وہوس، مادی ترقی پر ضرورت سے زیادہ توجہ اور کوشش، نیکی یا بھلائی کے کاموں میں نام ونمود میں زیادہ دلچسپی، اولاد اور گھر کے لوگوں کی تربیت میں غفلت، نہی عن المنکر کے فریضے سے پہلو تہی، کمزور طبقات کے لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی، جدید تعلیمی نظام میں طلبہ کی دینی و اخلاقی تربیت سے بے توجہی، علاقائی و مسلکی اختلافات میں شدت کا رویہ اور عالمی سطح پر امتِ واحدہ کے تصور کا فقدان، تعلیم یافتہ طبقے میں میڈیا یا ذرائعِ ابلاغ کی قوت و تاثیر کا عدم احساس یا احساس کے باوجود صحافت کے میدان میں دلچسپی کی کمی۔

مذکورہ بالا تحریروں سے متعلق اہم بات یہ کہ مصنفِ محترم نے ان میں اُن امور و مسائل کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا ہے جن کے حوالے سے اسلام، اسلامی نظامِ حیات اور اہلِ اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں اور ان کی تشہیر کے لیے پرنٹ و الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کا بے دریغ و بے جا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند مسائل یہ ہیں: انسانی حقوق، عوامی فلاح و بہبود کے کام، حقوقِ نسواں، عورت اور حجاب کی پابندی، دینی مدارس اور ان کا تعلیمی نظام۔

مصنف اس فکر کے حامل تھے کہ ایمان کی تازگی، عقیدہ کی اصلاح اور دل ودماغ میں اللہ کا

صحیح تصور نقش کرنے سے بڑھ کر خیر و برکت کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ اس سمت میں تقریری یا تحریری جو بھی کوشش کی جائے وہ بہر صورت باعثِ افادیت ہو گی۔ اس کوشش کے معروف ذرائع دو ہی ہیں: زبان اور قلم۔ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت و فضیلت ہے۔ موقع و محل، ضرورت اور مخاطب کی نوعیت کے اعتبار سے ان میں سے ہر ایک کی قوت و تاثیر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، تاہم ذہن سازی، سوچ میں تبدیلی لانے اور حالات کے سدھار میں قلم کی افادیت ہمیشہ مسلم رہی ہے، اور غلط سوچ رکھنے، راہِ حق و اعتدال سے منحرف ہونے والوں اور فکری مخالفین سے مقابلہ کے لیے ''قلم'' بلا شبہ ہتھیار کا کام کرتا ہے۔ جب اس ہتھیار کا استعمال رک جاتا ہے یا اس کے استعمال کرنے والے کم ہو جاتے ہیں تو معاشرے پر اس کے بڑے منفی اثرات پڑتے ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ذہن سازی کا کام متأثر ہوتا ہے۔ زبانی باتوں یا تقریر کا اثر کچھ نہ کچھ ہوتا ہے، لیکن کم ہوتا ہے، وقتی ہوتا ہے اور دیرپا نہیں ثابت ہوتا۔ واقعہ یہ کہ کسی کی بات سن کر یا کسی تحریر کو پڑھ کر متأثر ہونے سے پہلے انسان کی فکر و سوچ میں بدلاؤ آتا ہے، پھر اس تبدیلی کے اثرات اس کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے بعد اس کی عملی زندگی میں خوش گوار تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے اعمال و کردار دوسروں کو بھی متأثر کرتے ہیں اور اس طرح سماجی زندگی کی اصلاح و بہتری کی راہیں ہموار ہوتی ہے۔ اس پہلو سے پیشِ نظر کتاب بلا شبہ ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔ انسانی معاشرے میں قلم اور اہل قلم کے کردار کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کے خسارے کی جانب فاضل مصنف نے متوجہ کیا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب کا اولین ایڈیشن دار الرشید لکھنؤ سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۲۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ مختلف اوقات میں رسائل و اخبارات میں شائع شدہ مضامین پر مشتمل ہے۔ طبع اول میں ۲۹ مضامین اور طبع دوم میں ۱۴ مضامین کے اضافے کے ساتھ اس مجموعے میں کُل ۴۳ مضامین ہیں۔ دونوں ایڈیشن کے صفحات بالترتیب ۱۹۸، ۲۵۶ ہیں (پیشِ نظر مضمون میں صفحات نمبر کے حوالے جدید ایڈیشن کے مطابق ہیں)۔

کتاب کے مشتملات پر سرسری نظر ڈالنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر مضمون میں موجودہ دور کے مذہبی، سماجی، معاشی و سیاسی مسائل میں سے کسی ایک مسئلے پر بے لاگ اظہار کے خیال کے ساتھ اس کے حل کے لیے مناسب و مفید مشورے دیے گئے ہیں۔ معاشرتی زندگی کی خرابیوں،

سماجی برائیوں یا اخلاقی کمزوریوں میں سے کسی ایک کے حوالے سے اس کے برے اثرات کو بے نقاب کیا گیا ہے اور خیر خواہانہ انداز میں انہیں دور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اہم بات یہ کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں در آئی خرابیوں یا برائیوں سے نجات پانے کی تدابیر میں قرآنی ہدایات، حدیث نبوی ﷺ کی تعلیمات اور شریعت کے احکام کی تشریح و ترجمانی کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور حیاتِ صحابہ کرامؓ اور علمائے سلف کی عملی زندگی سے مثالیں پیش کر کے روزمرہ زندگی میں ان کی اتباع کی ضرورت و افادیت اجاگر کی گئی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں معاشرے کے جن مخصوص طبقات کے مسائل خاص طور سے زیرِ بحث آئے ہیں اور جن سے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، وہ ہیں: خواتین، اطفال، مدارس و متعلقینِ مدارس، اہلِ صحافت، سربراہانِ ریاست و اہلِ حکومت، مزدور اور معاشی اعتبار سے کمزور طبقات کے لوگ۔ مزید یہ کہ معاشرت و معیشت کے جن مسائل سے متعلق اسلامی تعلیمات اور شرعی قوانین کو نقد و اعتراض کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا جان بوجھ کر ان کے بارے میں حقائق کو مسخ کیا جاتا ہے، پیشِ نظر کتاب میں ان کی مدلل تردید کی گئی ہے اور متعلقہ مسائل کے بارے میں اسلام کی اصولی تعلیمات اور قانونی نکات کی وضاحت کے ساتھ موجودہ دور میں ان کی اہمیت و معنویت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ واقعہ یہ کہ کتاب میں شامل ہر تحریر کسی نہ کسی پہلو سے لوگوں کی مذہبی، اخلاقی، سماجی، معاشی، سیاسی زندگی کی اصلاح سے تعلق رکھتی ہے۔

معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت کے جن مسائل و معاملات کے تئیں دنیا کے مختلف ممالک بالخصوص مغرب میں غیر متوازن، غیر معتدل اور غیر منصفانہ یا بے حسی کا رویہ پایا جاتا ہے اور اُلٹے ان کے حوالے سے اسلام، اسلامی شریعت و اسلامی نظامِ حیات کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، مصنف نے کتاب میں شامل متعدد تحریروں میں ان کا محاکمہ بڑے عمدہ و مؤثر اسلوب میں کیا ہے۔ اِن مسائل و معاملات میں یہ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں: حقوقِ نسواں، انسانی حقوق، خدمتِ خلق، عوامی فلاح و بہبود کے کام، نظامِ تعلیم و تربیت، اصولِ سیاست و حکومت، اظہارِ رائے کی آزادی۔ مزید یہ کہ جن امور و مسائلِ حیات کے تئیں مسلمانوں کی عملی زندگی میں کوتاہی، غفلت و لاپرواہی پائی جاتی ہے کتاب کے مشتملات میں مختلف مقام پر ان کو بلا لاگ لپیٹ واضح کیا گیا ہے اور ان امور میں دوسروں کی نقالی یا ان کا طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے دینِ برحق

کے اصول و ضوابط اور اس کی تعلیمات پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہونے کی مخلصانہ دعوت دی گئی ہے۔ ان میں کچھ اہم امور یہ ہیں: عورتوں کے حقوق کا تحفظ، بچوں و نوجوانوں کی دینی و اخلاقی تربیت، قول و فعل میں مطابقت، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں توازن، لوگوں سے تعلقات و معاملات میں حسنِ اخلاق کا مظاہرہ، اہلِ اسلام کے نظامِ تعلیم کا مذہب اور اخلاقیات سے گہرا ربط و تعلق، مال و دولت کی بڑھتی ہوئی حرص، مالی معاملات میں دیانت داری و شفافیت، بلا کسی تفریق سماج کے مختلف طبقے کے لوگوں کے ساتھ خیر خواہانہ و ہمدردانہ رویہ، جذباتیت اور شدت پسندی سے اجتناب۔ مصنفِ موصوف نے ان سب مباحث کا مقصد یہ واضح کیا ہے کہ اسلامی تعلیمات اور شرعی قوانین پر عمل پیرا رہنے سے خود ان کا اور اللہ کے دوسرے بندوں کا بھلا ہوگا، اسلام و مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہوں گی اور ان کی زندگی کا مشاہدہ کرنے والے نہ صرف ان کے طرزِ زندگی سے متاثر ہوں گے، بلکہ ان میں دینِ متین سے قریب ہونے کی طلب پیدا ہوگی۔ ان سب کے علاوہ پیشِ نظر کتاب سے عالمی سطح پر عوام و خواص دونوں کے لیے جو قیمتی پیغامات یا مفید نکات ملتے ہیں ان میں کچھ یہ ہیں: گذشتہ زمانے میں عوام کے ساتھ ظلم و زیادتی اور غیر منصفانہ رویہ اپنانے والے حکمرانوں کا عبرت ناک انجام، زندگی کے معاملات میں توازن و اعتدال قائم نہ رکھنے کے نقصانات، ذرائعِ ابلاغِ عامّہ کے غلط استعمال کے مضر اثرات، بلا تحقیق و تفتیش کسی واقعے کی تشہیر یا خبر کی ترسیل و اشاعت کے باہمی معاملات اور سماجی تعلقات پر منفی اثرات، کسی بھی معاملے میں دُہرا معیار اپنانے سے صداقت اور واقعیت کا مجروح ہونا اور بالآخر برے نتائج کا موجب بننا۔ حقیقت یہ کہ مصنفِ محترم کی معروضات، کتاب کے تذکیری نکات اور تحریر کا خیر خواہانہ اسلوب لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو پاکیزہ، صحت مند اور باعثِ خیر بنانے کے نقطۂ نظر سے افادیت سے بھرپور، لائق توجہ اور طالبِ عمل ہیں۔

زیرِ تعارف کتاب کے مشتملات کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف اسلام کے بنیادی علوم (علم قرآن، حدیث و فقہ اسلامی) میں مہارت کے ساتھ عصری علوم (سماجیات، معاشیات و سیاسیات) اور انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھے، جیسا کہ مضامین میں انگریزی کے مختلف النوع لٹریچر سے استفادہ، انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے استعمال اور مغربی مفکرین، اسکالرز و مصنفین کے ناموں کے اردو کے ساتھ انگریزی میں درج کرنے کی بہت سی مثالیں ملتی

ہیں۔ مزید اہم بات یہ کہ پیشِ نظر تحریروں میں کتابوں کے علاوہ معاصر رسائل و اخبارات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ کتاب میں جمع کردہ مواد سے یہ شہادت ملتی ہے کہ مولانا مرحوم اپنے ملک، دیگر ایشیائی اور مغربی ممالک کی گذشتہ تاریخ کے وسیع مطالعے کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور معاصر دنیا کے سماجی، معاشی و سیاسی احوال سے اچھی طرح باخبر تھے۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ صاحبِ کتاب میدانِ صحافت کے شناور تھے، ایک طویل عرصے تک وہ ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ عربی اخبار "الرائد" کے مدیر کی ذمہ داری انجام دیتے رہے ہیں اور دوسرے عربی رسائل و اخبارات کے مستقل قاری رہے ہیں۔ اِن علمی مصروفیات کے طفیل میں انہیں عرب ممالک کے علاوہ غیر مسلم ملکوں کے سماجی، ثقافتی و سیاسی حالات سے اچھی طرح واقف رہنے کا موقع ملا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے اہلِ مغرب سے تعلقات و روابط کے شاخسانہ میں ان کے افکار وخیالات اور عادات و اطوار کے زیرِ اثر مسلم معاشرے میں جو خرابیاں و برائیاں سرایت کر گئی تھیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی میں جو فساد و بگاڑ آگیا تھا، مصنف اُن کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ کتاب میں ان کی نشان دہی کے ساتھ ان کے اسباب و عوامل کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں مسلم معاشرے کی بگڑی ہوئی صورتِ حال کی عکاسی کے ساتھ اس کی اصلاح اور بہتری کے لیے قرآن کریم، سنتِ نبوی ﷺ، حیاتِ صحابہؓ سے حصولِ رہنمائی اور نصیحت اخذ کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ دوسری جانب معاشرے کے کچھ مخصوص طبقات (خواتین، بچے، جوان، مزدور و محنت کش، غرباء، محتاج و بے سہارا اور دیگر کمزور طبقات کے لوگوں) کے حالات میں بہتری لانے کی خاطر برادرانِ اسلام کو قرآن مجید، سیرتِ نبوی ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی حیاتِ مبارکہ سے سبق حاصل کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ تیسرے ملک اور بیرونِ ملک کے بعض طبقوں کی جانب سے اسلام و اسلامی شریعت میں مسلم خواتین، بچوں، اسلامی نظامِ تعلیم، اسلامی نظامِ حکومت سے متعلق اصول و ہدایات اور سماج کے مختلف طبقے کے حقوق سے متعلق حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے تعلق سے اسلام اور اس کے ماننے والوں کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے ازالے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے مشتملات کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ در اصل

قرآن کریم کے اس پیغام کی ترجمانی و تشریح ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً (البقرۃ:۲/۲۰۸) (اے ایمان والو! پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ)، یعنی اہلِ اسلام سے زندگی کے تمام معاملات میں اسلام کی تعلیمات اور شریعت کے قوانین پر عمل مطلوب ہے۔ دوسرے اس کتاب کے توسط سے صاحبِ کتاب کا مقصود قارئین کو یہ قیمتی پیغام دینا ہے کہ اگر وہ حکمِ الٰہی پر بلا تاخیر و بلاچوں چرا عمل کرنے کی مثالی صورت دیکھنا چاہتے ہیں تو سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ کریں یا اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں، اور پھر حیات نبوی ﷺ کے واقعات سے سبق حاصل کرتے ہوئے زندگی کے تمام معاملات (عبادات، اخلاقیات، معاملات، سماجیات، اقتصادیات وسیاسیات و حکومت) میں وہی طریقہ اپنائیں جو ہادیِ برحق و معلم انسانیت ﷺ اپنے قول و فعل سے سکھا گئے ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت کو ہمیشہ سامنے رکھیں: وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۳۳/۲۳) (اور تم سب کے لیے بہترین نمونہ ہے اللہ کے رسول ﷺ (کی حیاتِ مبارکہ) میں)۔

زیرِ مطالعہ کتاب کا ایک مفید و قابلِ قدر پہلو برمحل آیات و احادیث کے متن (مع اردو ترجمہ) کا حوالہ ہے۔ یہ نصوص خاص طور سے ان مقامات پر نقل کیے گئے ہیں جہاں روز مرّہ زندگی میں احکامِ الٰہی اور سنتِ رسول ﷺ کی اتباع کی اہمیت ذہنوں میں نقش کرنا مقصود ہے یا جہاں قرآن کریم اور سیرتِ نبوی ﷺ کے حوالے سے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور اخلاقی خرابیوں سے دور رہنے پر زور دیا گیا ہے اور مصائب و مشکلات سے نجات اور مسائل کے حل کا سب سے اہم ذریعہ قرآن و سنت پر کاربند رہنے کو قرار دیا گیا ہے۔ مولانا کے خیال میں اس کے بغیر نہ تو مغربی تہذیب کے اثرات سے حفاظت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ ہی غیر اسلامی طرز عمل سے بچا جا سکتا ہے۔

سادہ زبان، مشکل و پیچیدہ تراکیب سے پاک، چھوٹے چھوٹے جملے، آسان مگر دل نشیں اسلوب، موثر اندازِ بیان، افہام و تفہیم یا کسی خاص نکتے کی وضاحت کے لیے سوال و جواب کا پیرایہ، مصنف کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ مولانا کا یہ ایک منفرد اندازِ تحریر تھا کہ کسی اہم نکتے کی طرف قارئین کو متوجہ کرنے یا ان تک اپنے کسی خاص پیغام کو پہنچانے کی خاطر رمزیت (یا اشاروں و کنایوں میں اپنی بات پیش کرنے) کے اسلوب کا سہارا لیتے تھے۔ کسی مضمون یا تحریر میں ”رمزیت“ کی ضرورت کیوں پڑتی ہے اور اس اسلوب کا سہارا کن حالات میں لیا جاتا ہے، اسے مصنف کے

والدِ گرامی مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ نے اپنی تقریظ میں ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ”جبر و قہر کے ماحول میں رمزیت وجود میں آتی ہے اور اس کی مثالیں تاریخِ ادب میں ملتی ہیں، اس لیے طنزیہ اسلوب اِس عہد کے لیے مؤثر و مناسب معلوم ہوتا ہے“[۲]۔

کتاب کے مباحث میں یہ نکتہ بار بار ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ قرآن کریم اور اس کی قولی و عملی تشریح حدیث اور سیرتِ نبوی ﷺ کی صورت میں اہلِ اسلام کے پاس رہنمائی کے بنیادی مآخذ موجود ہیں۔ اگر وہ ان سے رہنمائی نہیں حاصل کریں گے اور ان کے واضح کردہ طریقے کے مطابق روزمرہ زندگی نہیں بسر کریں گے تو ان کا فیض کیسے انہیں پہنچے گا، درپیش مسائل کیوں کر حل ہوں گے اور ان کی مشکلات کس طرح دور ہوں گی؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے کہ مریض کے پاس طبیبِ حاذق کا لکھا ہوا بہترین نسخہ رکھا ہے، لیکن وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائے گا یا اس کی تجویز کردہ دوا استعمال نہیں کرے گا تو اسے کیسے صحت یابی نصیب ہوگی۔ اس سوال کی معنویت واضح کرتے ہوئے وہ اپنے مضمون (نسخہ معاشرہ کی اصلاح کا) میں تحریر کرتے ہیں: ”نسخہ تو ہم رکھتے ہیں، لیکن اس کا استعمال دوسروں پر کرتے ہیں، سلام کرے تو دوسرا، رحم کرے تو دوسرا، عیادت کرے تو دوسرا، معاف کرے تو دوسرا، خدمت کرے تو دوسرا، غصہ نہ کرے تو دوسرا، خیال کرے تو دوسرا، خوش اخلاقی سے پیش آئے تو دوسرا، مسکرا کر ملے تو دوسرا، راز رکھے تو دوسرا، مہمان نوازی کرے تو دوسرا، پڑوسی کا حق ادا کرے تو دوسرا، رشتہ جوڑے تو دوسرا، راستہ میں کوڑا نہ ڈالے تو دوسرا، کسی کو تکلیف نہ دے تو دوسرا، اپنے حق سے دستبردار ہو تو دوسرا...... کیا معاشرہ دوسروں سے بنتا ہے؟ کیا اللہ کی اس سرزمین پر صرف دوسرے بستے ہیں؟ کیا اسلامی اخلاق و آداب کا تعلق صرف دوسروں سے ہے؟“[۳]۔

موجودہ دور میں معاشرتی اصلاح کی بعض انفرادی یا اجتماعی کوششوں کے بے اثر ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحبِ کتاب اپنے مضمون ” اسلامی نظامِ حیات“ میں رقم طراز ہیں: ”یہ نتیجہ ہے دین کی من مانی تشریح کا، حضور ﷺ نے جس عمل کو جو حیثیت دی، جو اس کو قیمت دی، زندگی میں جو اس کا تناسب رکھا، ہم نے وہ حیثیت بدلی، وہ قیمت بدلی، وہ تناسب بدلا، اور اپنے

---

[۲] دعوتِ فکر و نظر، ص ۱۴ / تقریظ
[۳] دعوتِ فکر و نظر، ص ۱۰۸

مزاج، اپنے شوق، اپنی پسند اور اپنی طبیعت کے اعتبار سے دینی شعبوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کیا اور اپنا سارا زور، ساری طاقت اور ساری توانائی اسی پر صرف کر دی اور دین کے بقیہ شعبوں کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے کہ ان کا دین سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے، جب کہ ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ دین میں پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ”ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً“(البقرۃ:۲/۲۰۸)......نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:”الایمان سبعون شعبۃً“/ ایمان کے ستّر شعبے ہیں۔ غلطی ہم نے یہ کی کہ ہم نے ایمان کو عقائد و عبادات، اذکار و اوراد اور صرف دینی وضع قطع تک محدود کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان ہماری ذاتی زندگی میں تو نظر آیا، سماجی میں نہیں، اس کے اثرات ہماری انفرادی زندگی پر تو پڑے معاشرتی زندگی پر نہیں“[۴]۔

”دعوتِ فکر و نظر“ کے مصنف نے ”آج کی قربانی“ کے عنوان سے اپنی تحریر میں موجودہ حالات میں ضروری قربانیوں کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:”آپ اپنی خواہشات سے دست بردار ہو جائیے،(غیروں کے)عادات و اطوار سے اپنے کو آزاد کرائیے، خاندانی طور و طریق سے اپنا پیچھا چھڑائیے، جاہلی رسم و رواج کی مخالفت اپنا شعار بنائیے، اور اپنے ہر کام، ہر معاملہ اور ہر مسئلہ میں شریعت کے حکم کو اپنانے پر فخر محسوس کیجیے، ملت کو اپنی ذات پر ترجیح دیجیے، ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر مذہبی و ملی کاموں کے لیے کچھ وقت ضرور نکالیے، کسی بھی کام میں ناک کو بیچ میں نہ لائیے، برائی کا جواب اچھائی سے، قطعِ رحمی کا جواب صلۂ رحمی سے، نفرت کا جواب محبت سے، اختلاف کا جواب اتحاد سے، حق تلفی کا جواب حق کی ادائیگی سے دیجیے۔یہی آج کی سب سے بڑی قربانی ہے، اور اس وقت اس کی سب سے زیادہ کمی ہے“[۵]۔مطلوبہ مقصد کے حصول کے لیے یہ قربانیاں کیسے رنگ لائیں گی یا نتیجہ خیز ثابت ہوں گی؟ اس نکتہ کو مولانا مرحوم نے مختصر، مگر مؤثر انداز میں ان الفاظ میں واضح کیا ہے:”مال کی قربانی، جان کی قربانی اور وقت کی قربانی اسی وقت رنگ لائے گی اور اس کے بہتر نتائج اسی وقت سامنے آئیں گے جب ہم اپنی ان خامیوں (اعتدال کی کمی، ہوش مندی و معاملہ فہمی کی کمی، قوتِ برداشت کی کمی، باہمی اعتماد کی کمی) کو دور کر کے اپنی اِن کمزوریوں (خود رائی، خود پسندی، نفس پرستی، گروہ بندی اور جاہ طلبی) پر قابو پائیں گے،

---

[۴] دعوتِ فکر و نظر، ص۲۴۶

[۵] دعوتِ فکر و نظر، ص۵۱

اپنی ذات کو ملّی مفاد کی راہ میں کبھی حائل نہ ہونے دیں گے"[۶]۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی مرحوم کے پسندیدہ موضوعات میں تعلیم، قدیم و جدید تعلیمی اداروں کا نظامِ تعلیم و تربیت بھی شامل رہا ہے۔ اس موضوع پر بھی ان کی نگارشات بڑی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ زیرِ تعارف کتاب میں شامل ایک مضمون "تعلیم" اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں انہوں نے جدید تعلیم کی کیفیت و اس کے لوازمات، اولاد کو اس سے آراستہ کرنے میں والدین یا سرپرستوں کی ہر قسم کی قربانی کے لیے بخوشی آمادگی، موجودہ دور میں اس میں بڑھتی ہوئی بے پناہ دل چسپی اور خانگی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر اس کے مضر اثرات پر بے لاگ اظہارِ خیال کیا ہے اور دل میں چبھنے والا یہ سوال اٹھایا ہے کہ جو تعلیمی نظام ایک خاص مذہب، کلچر و فکر کی نمائندگی کرتا ہو، جس کا تعلق صرف مادّی دنیا یا محض دنیوی زندگی کی تعمیر و ترقی سے ہو، جس کے تحت طلبہ کی دینی و اخلاقی تربیت کا کوئی نظم نہ ہو، اسے پورا کا پورا قبول کر لینا ملک و ملت اور خود ہمارے لیے کیسے مفید ہو سکتا ہے؟[۷]۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس نظامِ تعلیم سے بچوں و بچیوں کو مستفیض کرنے کے لیے ماں باپ و سرپرست اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے ہیں، جسمانی و مالی ہر طرح کا بوجھ برداشت کرتے ہیں، اولاد کے مستقبل کی تعمیر کی راہ میں صبح سویرے انہیں اسکول کے لیے تیاری میں ماں اپنی میٹھی نیند بھی تیاگ دیتی ہے، اس تعلیم سے اولاد کی آراستگی کے بعد ماں باپ کو کیا ملتا ہے؟ اس پر مصنفِ گرامی کا عبرت ناک تبصرہ خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"ایک سنہرے مستقبل کی امید میں ماں باپ کو یہ سب گوارا، آخر وہ مستقبل جب حال میں بدلتا ہے، لیکن افسوس کہ تب تک ماں باپ کے خوابوں کا وہ شیش محل چکنا چُور ہو چکا ہوتا ہے، بڑھاپا ہے اور لق و دق مکان کی حفاظت کا مسئلہ ہے، صاحبزادہ جا چکے ہیں آسٹریلیا اور صاحب زادی کی رخصتی ہو چکی ہے کنیڈا، رہے وہ دونوں تو اب ان کی عمر کہیں جانے کی نہیں ہے، آرزوئیں تمام دم توڑ چکی ہیں، تمنّائیں ایک ایک کر کے سب رخصت ہو چکی ہیں، اب تو اپنی رخصتی کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے، فکر ہے تو اس بات کی کہ کیسے ہو گا یہ سفر، کس کے کاندھے پر ہو گا، زادِ سفر کہاں سے آئے گا،

---

[۶] دعوتِ فکر و نظر، ص ۵۱۔۵۲

[۷] دعوتِ فکر و نظر، ص ۱۲۴

راستے کی ضرورتیں کون پوری کرے گا، منزل تک پہنچانے کے فرائض کون انجام دے گا......“[۸]۔

زیرِ بحث مضمون کا ایک قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار نے مغربی نظامِ تعلیم (جس پر جدید نظامِ تعلیم کی عمارت کھڑی ہے) کے نقصان دہ اثرات کی نشان دہی کرنے کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر قوم کو جدید تعلیم کے فیض یافتگان اور عصری علوم کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ”مسلم معاشرے کو بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے، لیکن اسلامی تعلیمات کے ساتھ، اعلیٰ انسانی قدروں کے ساتھ، ہمدردی و غمخواری کے جذبے کے ساتھ دوسروں کے دکھ درد کے احساس کے ساتھ، اور یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں تو اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کے مرحلے سے گذر کر“[۹]۔

کتاب میں بچوں کی تربیت کے موضوع پر ایک تحریر ”بچوں کی تربیت کے کچھ رہنما اصول“ کے عنوان سے ہے۔ اس میں کچھ مشاہدات و واقعات پیش کر کے ان کی تربیت میں اس پہلو پر خاص زور دیا گیا ہے کہ ان کے سامنے اچھی باتوں و عادتوں کی عملی مثالیں پیش کر کے انہیں خود سنبھلنے و صحیح رخ پر نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے، ان کی غلطیوں و کوتاہیوں پر ڈانٹ ڈپٹ یا بہت زیادہ روک ٹوک کے بجائے سلجھے ہوئے انداز میں انہیں سمجھایا جائے اور ان کے سامنے اچھے طور و طریق کو اپنا کر دکھایا جائے تاکہ انہیں سبق حاصل ہو اور اپنے بگڑے ہوئے طور و طریق کو سدھار لیں۔ اگر سمجھانے بجھانے کے باوجود کوئی بچہ اپنی ماں کی بات پر دھیان نہیں دے رہا ہے اور اپنی کوتاہیوں کو نہیں چھوڑ رہا ہے یا اپنی غلط حرکتوں سے باز نہیں آرہا ہے تو ایسی صورتِ حال میں بچوں کے ساتھ سخت رویہ اپنانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح بچہ جب اپنی حرکتوں کی وجہ سے کچھ تکلیف محسوس کرے گا تو دھیرے دھیرے اپنی خراب عادت سے باز آجائے گا اور ماں کا فرماں بردار بن جائے گا[۱۰]۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں علاقائی، مسلکی و فقہی اختلافات کے نتیجہ میں امتِ واحدہ نے امتِ متفرقہ کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اس کے منفی اثرات سے مساجد و عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکی ہیں، مزید باعثِ تشویش یہ کہ اندرونِ ملک کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی

---

[۸] دعوتِ فکر و نظر، ص۱۲۳۔۱۲۴

[۹] دعوتِ فکر و نظر، ص۱۲۵

[۱۰] دعوتِ فکر و نظر، ص۱۸۰۔۱۸۲

اس کے اثرات نظر آتے ہیں، جس کا ایک مظہر کسی ملک یا علاقہ یا مسلک کے نام سے منسوب مساجد کے ناموں میں نظر آتا ہے۔ ایک نو مسلم جرمن دانشور و معروف مصنف مراد ہوف مین (Murad Wilfried Hofmann)(م: ۱۳/ جنوری ۲۰۲۰ء) کے حوالے سے مصنف نے اس تکلیف دہ صورتِ حال کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے: ”حیرت کی بات ہے کہ جرمنی جیسے ملک میں مسلمانوں میں علاقائی تقسیم کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، یہاں کی مسجدوں کی نسبت بجائے اسلام کی طرف ان علاقوں کی طرف کی جاتی ہے جہاں کے باشندے اس مسجد کے قرب و جوار میں آباد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ہیمبرگ میں گیارہ مسجدیں ہیں اور ہر مسجد کا نام اس علاقے کے نام پر رکھا گیا ہے جہاں کے لوگ اس مسجد کے آس پاس رہتے ہیں، مثلاً پاکستانی مسجد، ہندوستانی مسجد، بوسنیائی مسجد، ترکی مسجد، افغانی مسجد، افریقی مسجد۔ علاقوں کی طرف مسجدوں کی یہ نسبت نماز پڑھنے والوں میں ایک تعصب پیدا کرتی ہے اور امت مسلمہ کا عالمی تصور ان کے ذہن و دماغ سے جاتا رہتا ہے“[11]۔ پھر ہندوستان میں فکری و مسلکی لحاظ سے مساجد کی جو تقسیم پائی جاتی ہے اور اس تقسیم کے نتیجہ میں آپس میں جو اختلافات ابھرتے ہیں یا ایک دوسرے فرقہ و مسلک کی مسجد میں داخلہ وعدم داخلہ کے سلسلہ میں جو تنازعات پیدا ہوتے ہیں اس کی منظر کشی صاحبِ کتاب ان الفاظ میں کرتے ہیں: ”ہندوستان کی صورتِ حال کچھ اور خطرناک ہے، یہاں مسلمانوں میں علاقائیت تو نہیں، لیکن مسلک اور برادری کی بنیاد پر عصبیت شدت اختیار کرتی جارہی ہے اور بعض شہروں میں تو صورتِ حال اتنی بگڑ چکی ہے کہ دوسرے مسلک یا دوسری برادری کا آدمی کسی دوسرے مسلک یا دوسری برادری کی مسجد میں نماز تک نہیں پڑھ سکتا ہے، بلکہ بعض مسجدوں میں یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ اس مسجد میں فلاں فلاں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں“[12]۔

خاندانی، معاشرتی، معاشی زندگی پر جدید تہذیب کے تباہ کُن اثرات کو بے نقاب کرنے کے بعد مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تہذیب پوری دنیا بالخصوص عالمِ اسلام کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہ بہت اہم سوال ہے کہ اس چیلنج سے کیسے نمٹا جائے، اس کے بادِ سموم سے لوگوں،

---

[11] دعوتِ فکر و نظر، ص ۶۴

[12] دعوتِ فکر و نظر، ص ۶۴

خاص طور سے نوجوانوں کو کیسے بچایا جائے؟ ان کی رائے میں اس مسئلہ کا بس یہی حل ہے کہ اہلِ اسلام اپنی مذہبی تعلیمات اور اپنی تہذیب و ثقافت کو سینے سے لگائے رکھیں، اس کی قدر و قیمت اور افادیت محسوس کریں اور دوسروں کے دلوں میں بھی اسے جاگزیں کرنے کی فکر و کوشش کریں، مغربی تہذیب کی ظاہری رنگینیوں و رعنائیوں سے مسحور کرنے والے شیطانی وسوسوں یا تانے بانے سے اپنے کو آزاد کرلیں اور قرآن و سنت سے اپنا تعلق مضبوط سے مضبوط تر کرلیں۔ اس تہذیب کے تعلق سے شیطان کی دسیسہ کاریوں سے وہ اِن الفاظ میں متنبہ کرتے ہیں: ''جب بھی کوئی بری چیز اچھی نظر آنے لگے، بدنما خوش نما معلوم ہونے لگے، موت زندگی سمجھی جانے لگے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں شیطان کا ہاتھ ہے، انسان کا یہ ازلی دشمن نظر بندی میں ماہر ہے، ہوتا کچھ ہے، دکھاتا کچھ ہے، بھینس کے گوبر اور گھوڑے کی لید کو سونا چاندی یہ دکھائے اور سونے اور چاندی کے ڈھیر کو گوبر اور لید یہ بتائے، کٹی ہوئی گردن کو جُڑی ہوئی اور جڑی ہوئی گردن کو کٹی ہوئی دکھانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اسی پر لوگوں کو متنبہ کیا ہے:وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (العنکبوت/۳۸) (اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کی نظر میں خوش نما بنا کر ان کو صحیح راستے سے روک دیا، حالاں کہ وہ دیکھتے بھالتے لوگ تھے)'' (۱۳)۔ اس موقع پر سورۃ الاعراف کی آیات/ ۲۰۰- ۲۰۱ کو یاد کر لینا بہت برمحل و اہم معلوم ہوتا ہے، ان کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شیطان تمھیں کسی برے یا گناہ کے کام کے لیے اکسائے تو اس سے دور رہنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگو، بے شک وہ سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے، اور اہلِ تقویٰ یا پرہیز کا راستہ اختیار کرنے والوں کی خاصیت یہ ہے کہ اگر شیطان کے بہکاوے سے کوئی برا خیال یا برے کام کا ارادہ ان کے نفس میں ابھرتا ہے تو وہ فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں، وہ شیطان کی چال کو سمجھ جاتے ہیں اور انہیں صحیح و غلط بات / کام کا شعور ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ زیر تعارف کتاب کے مباحث کا سب سے اہم پیغام یہ ہے کہ موجودہ دور کے مسلمان اپنی روزمرہ زندگی کے مختلف شعبوں میں قرآن کریم اور سیرتِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہوکر ہی اپنے حالات سدھار سکتے ہیں، اپنے لیے دنیوی و اخروی دونوں زندگی کو خوش گواری سے ہم کنار کر سکتے ہیں اور ان سب کے علاوہ اسلام اور اہلِ اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور کر سکتے ہیں۔

(۱۳) دعوتِ فکر و نظر، ص ۲۲۴۔۲۲۵

عربی نعت گو شاعر علی احمد باکثیر

ڈاکٹر وسیم حسن راجا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر
drwasim2211@gmail.com

ہر دور میں شاعری کا ایک اہم مقصد کسی عظیم شخصیت کی تعریف و توصیف کرنا رہا ہے۔ لیکن جب سے شاعروں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کرنا شروع کی، اس فن کو ایک الگ شناخت "مدح نبوی" کے نام سے ملی۔ یہ دراصل شاعری کی وہ صنف ہے جس میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔ اس صنفِ شاعری میں شاعر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی اور جسمانی صفات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کی خواہش، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ مقدس مقامات کی زیارت کرنے کی تڑپ کا اظہار کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات، غزوات اور پاک کردار کی تعریف و توصیف بھی اس صنف کا ایک اہم جزو ہے۔

حسان بن ثابت، کعب بن مالک، الأعشی، اور فرزدق جیسے مشہور عرب شعرا اپنے دور کے بہترین نمونے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے خود اپنے رسول کی تعریف فرمائی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ، مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نے بھی ہر دور میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کے حوالے سے بہت شاعری کی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ شعرا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت اور احترام رکھتے تھے۔ ایسا کوئی دور یا زمانہ نہیں گزرا اور نہ ہی کوئی اسلامی قوم یا مسلمانوں کا کوئی گروہ ایسا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف میں شعر نہ کہے گئے ہوں۔

علی احمد باکثیر ایک ایسی ہی نابغۂ روز گار شخصیت ہیں جن کی مانند زمانے میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ چند ادبی شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے شاعری کے علاوہ دوسرے ادبی اور فنکارانہ

میدانوں میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔ ان کی پیدائش ۱۵/ذی الحجہ ۱۳۲۸ ہجری، مطابق ۲۱/دسمبر ۱۹۱۰ء کو انڈونیشیا کے شہر سورابایا میں ہوئی۔ ان کی چند مشہور تصانیف میں "واسلاماہ"، "الثائر الأحمر"، "سر الحاکم بأمر اللہ" اور "سرّ شہرزاد" شامل ہیں۔

علی احمد باکثیر ایک عظیم شاعر اور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم صوفی بھی تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی مدح سرائی میں جو قصیدے لکھے، ان میں سے "نظام البردۃ" نے انہیں اسلامی دنیا میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ یہ قصیدہ نبوی مدح سرائی کا ایک شاہکار ہے اور اسے اسلامی ادب کا ایک عظیم سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قصیدے میں شاعر نے نبی کریم ﷺ کی مدح وثنا میں جو کچھ کہا ہے، اس سے ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گہری محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر نے یہ طویل قصیدہ ۱۹۳۲ء میں فرائض حج انجام دینے کے بعد اور مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے رجب المرجب کے مہینے میں جانے سے پہلے قلمبند کیا تھا۔ باکثیر نے احمد شوقی کے مدحیہ قصیدے سے متأثر ہو کر اسی طرز پر لکھ ڈالا۔ اس کا اندازہ قصیدے کے عنوان سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مصنف نے یہ قصیدہ در اصل علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرز پر لکھا ہے۔

علی احمد باکثیر نے یہ قصیدہ اپنے والد صاحب کی روح کے نام منسوب کیا ہے اور لکھا ہے: میرے کرم والے والد کی روح کے لیے جو اپنے رب سے جا ملے اور ان شاء اللہ نبی کے جوار میں فردوس اعلیٰ میں ہیں، یہ یادگار پیش کی جاتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اسے محمد ﷺ کے سامنے پیش کریں گے کیونکہ وہ اپنی نیک نفسی، تقویٰ اور اللہ کا ذکر کرنے میں میری نسبت زیادہ مستحق ہیں[1]۔

باکثیر نے قصیدے کی ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرنے والے ان شعراء کی تقلید نہیں کی جو کھنڈرات یا دیار پر روئے یا ذی سلم کے پڑوسیوں کے دور ہونے پر روئے یا جنھوں نے اپنی نظم کی ابتدا عشق و عاشقی سے کی۔ انہوں نے صرف ایک مطلع پیش کیا۔ وہ ایک ذاتی مطلع ہے جو اپنے مالک کی ذات، جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً:

---

[1] علي أحمد باكثير: نظام البردة، مكتبة مصر، قاهره، ۱۹۶۷، ص:۳

يا نجمة الأمل المغشىّ بالألم كوني دليلي في محلولك الظلم
في ليلة من ليالي القرّ حالكة صخابة بصدى الأرياح والديم
دجى تتالى كأمواج المحيط بها عقلي وقلبي وطرفي كل ذلك عمي
أكاد أرتاب في نفسي فأنكرها لولا مسيسي جسمي غير متّهم[۲]

(اے امید کا ستارہ جو غم سے ڈھکا ہوا ہے، ظلم کی اس اندھیرے میں میری رہنما بنیں۔ راتوں میں سے ایک ٹھنڈی رات، جو تیز ہواؤں اور بادلوں کی آوازوں سے گونج رہی ہے۔ اندھیرا جو سمندر کی لہروں کی طرح مسلسل چھا رہا ہے۔ میرا ذہن، میرا دل اور میری آنکھیں، سب کچھ اندھے ہیں۔ میں اپنی ذات پر تقریباً شک کرتا ہوں اور اس کا انکار کرتا ہوں، سوائے میرے جسم کی اس شدید ضرورت کے جو مجھے بے شک کرنے نہیں دیتی)۔

شاعر نے اپنی نظم کے چھیالیسویں شعر میں اپنے جذبات، احساسات اور اسلام اور عربیت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے وطن (حضر موت) کو پیش کیا ہے جہاں خرافات، بدعات اور جاہلیت پھیلی ہوئی تھی۔ ان اشعار میں سے ایک یہ ہے:

يا ويح قلب بجنبي لا هدوء له يجيش بالهمّ كالبركان بالحمم!
يئنّ من ثقل الآمال تبهظه! إنّ الهموم رسالات من الهمم!
وأرجح الطرف في الأحقاف غارقة في الجهل فوضى بلا عدل ولا نظم
تفنّنت في الجهل ملاذّ العيش تاركة ما تقتضيه، فلم تفطر ولم تصم[۳]

(افسوس اس دل پر جو میرے سینے میں ہے اور جسے چین نہیں، فکر سے بھرا ہوا ہے جیسے آتش فشاں لاوا سے بھرا ہو۔ امیدوں کے بوجھ تلے کراہ رہا ہے، یقیناً پریشان کن خیالات بلند ہمتوں کے پیغام ہوتے ہیں۔ احقاف[۴] میں اکثر لوگ جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان میں بے انصافی اور بے نظمی ہے۔ وہ زندگی کی آسائشوں کو چھوڑ کر جاہلیت میں مگن ہیں اور جس کی ضرورت ہے اس کو پورا نہیں کیا، اس لیے روزہ نہ رکھا اور نہ افطار کیا)

اس طرح سے شاعر نے اپنی اہلیہ کی طرف اشارہ کیا جو حضرت موت میں جوانی میں فوت

---

[۲] ماخذ سابق، ص:۵

[۳] الزبيدي، عبد الحكيم: مجلة الرافد، الشارقة، ۲۰۱۴، ص:۳۸

[۴] احقاف قوم عاد کا علاقہ تھا جو یمن اور موجودہ عمان میں واقع تھا۔ اسی نام سے قرآن پاک میں ایک سورہ ہے۔

ہو گئی تھی۔ اس کے لیے اس نے کئی نظمیں اور ڈرامے لکھے تھے۔ یہاں سے شاعر اپنی ذہنی کیفیت اور شکایت سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں آ جاتا ہے اور تمام جذبات اور خیالات کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہتا ہے:

حتّى إذا وجدت عيناك نفسك في ربوع (طيبة) ذات المنهل الشبم
فيمّم (المسجد الميمون) في أدب بقلب مدّكر في ثغر مبتسم
واعمد إلى (الروضة) الغنّا فحيّ بها خير الخلائق من عرب ومن عجم!
قل السلام على فخر الوجود، على خير النبيين، طه المفرد العلم[۵]

(جب تم اپنی آنکھوں سے خود کو طیبہ کے باغوں میں دیکھو جو بہترین پانی والا ہے تو ادب کے ساتھ مسجد نبوی کی طرف رخ کرو اور مسکراتی ہوئی زبان کے ساتھ اپنے دل میں ذکر کرتے ہوئے روضہ طیبہ کی طرف بڑھو اور اس میں موجود تمام مخلوقات کے بہترین، عرب اور عجمیوں کے فخر، تمام نبیوں کے بہترین، طہٰ پر سلام کہو)

پھر باکثیر مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بات کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے معاملات کو کس طرح سنبھالتے تھے۔ وہ لوگوں کو نصیحت کرتے، ان میں انصاف کرتے اور اپنے صحابہ کو دین کی تبلیغ کے لیے دور دراز علاقوں میں بھیجتے تھے:

كان الرسول هنا يملي هدايته على الأنام بلا عيّ ولا لسم
كان الرسول هنا يلقى نصائحه فيطربون لها أشجى من النغم
وكان يقضي هنا بين الورى حكما أكرم بأحمد من قاض ومن حكم!
وكان من ههنا يزجي كتائبه لنصرة الدين من أصحابه البهم[۶]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اپنی ہدایت لوگوں پر جاری کرتے تھے بغیر کسی غلطی یا کمی کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اپنی نصیحت کرتے تھے اور لوگ ان کی نصیحتوں کو بہت

---

[۵] علي أحمد باكثير: نظام البردة، ص:۱۲

[۶] أحمد عبد الله السومحي: علي أحمد باكثير حياته وشعره الوطني والإسلامي، الطبعة الأولى، نادي الأدبي الثقافي، جدة، ۱۹۸۲م، ص:۱۹۳

شوق سے سنتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں لوگوں میں انصاف کرتے تھے اور احمد سے بہتر کون قاضی ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے اپنے صحابہ کو دین کی تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے:

پھر اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دنیا نور سے بھر گئی اور آسمان پر خوشی چھا گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے لیے نجات اور برکت تھے۔ آسمان والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر خوش تھے اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے لگے۔ جنت کے دروازے کھل گئے اور آسمان روشن ہو گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ساتھ انسانیت کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا:

جاءت به الدرة العصماء آمنة   فأشرق الكون من أنواره العمم!
واهتزّ أهل السموات العلا طربا   بمنقذ الكون ممّا فيه من أثم
وغنّت الحور أصوات السرور على   مقاعد النور في قدسيّة النغم
وسبّحت ربّها الأعلى الملائك عن   شكر وبشر بماحي الظلم والظلم
وأشرقت رحُبُ الجنّات وانفتحت   أبوابها، وتجلّى الله بالرُّحُم!

(پاک صفت خاتون حضرت آمنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنم دیا اور اس سے دنیا نور سے بھر گئی۔ آسمان والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر خوشی سے جھوم اٹھے کہ دنیا کو گناہوں سے بچانے والا آیا۔ حوروں نے خوشی کے نغمے گائے اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اندھیرا اور ظلم مٹانے والا آ گیا۔ جنت کے دروازے کھل گئے اور آسمان روشن ہو گئے اور رحمت خدا کا ظہور ہوا)

اسی طرح شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب و نسب کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاک ترین نسب اور اشرف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے سلسلے سے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی بہترین مخلوق ہیں:

كأنّما الخلق (روض) والرسول به (خلاصة العطر) من أزهاره الفغم[۷]

(گویا دنیا ایک باغ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ کے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو کا خلاصہ ہیں)

پھر علی احمد باکثیر صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شراب نہیں پیتے تھے، بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے اور اپنی قوم کی بری عادات و رسوم سے دور رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ ہی خیانت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین اخلاق اور عادات سے آراستہ کیا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئیں اور آپ ﷺ سے شادی کرنے کی پیشکش کی۔ یہ شادی بہت برکت کی بات تھی:

ما كان يعلم أنّ الله مرسله يوما لأمته، دع سائر الأمم
لكنّ مولاه قد حلّاه من صغر بكل عال من الأخلاق والشيم
رأت خديجة من أخلاقه عجبا وهي الغنيّة ذات الرأى والفهم
فكاشفته هواها في تزوّجه فكان عرسها من أبرك القسم[۸]

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک دن اپنی امت بلکہ ساری امتوں کا نبی بنائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن سے ہی بہترین اخلاق سے آراستہ کر دیا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کرنے کی پیشکش کی۔ ان کی شادی بہت برکت والی تھی)

علی احمد باکثیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں مزید کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض صفات و اخلاق یہ تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا بلکہ ہمیشہ معاف کرتے رہے سوائے اس کے کہ کسی نے اللہ تعالیٰ کی حرمت کی پامالی کی۔ اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت غضبناک ہوتے تھے:

---

[۷] علي أحمد باكثير: نظام البردة، ص ۱۹
[۸] ماخذ سابق، ص ۲۶

يلقى الأنام ببشر غير مصطنع ولا يكلّم شخصا غير مبتسم
يعفو ذنوب الورى في حقّه كرما ويقبل العذر من جان ومجترم
حتى إذا انتهكت لله حرمته رأيت غضبة ليث هيج في الأجم[۹]

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بغیر بناوٹ کے خوش چہرے سے ملتے تھے اور کبھی کسی سے بغیر مسکرائے بات نہیں کرتے تھے۔لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کچھ بھی کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں معاف کر دیتے تھے اور مجرموں کی معذرت کو قبول کر لیتے تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حرمت کی پامالی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شیر کی مانند غصے میں آ جاتے تھے)

پھر شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی کریم تھے اور اپنی چیز لوگوں کو دے دیتے تھے اور اس پر کسی قسم کا تکبر یا فخر نہیں کرتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ سخاوت کرنے والے تھے:

يعطي العفاة عطاء غير منقطع بلا حساب ولا منّ ولا برم[۱۰]

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بغیر کسی حساب کتاب کے اور بغیر کسی تکبر کے مسلسل عطا فرماتے رہتے تھے)

پھر شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کی طرف توجہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنی اس زندگی کو لذتوں کا ذریعہ نہیں بنایا جیسا کہ مغربی مفکرین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی ہے:

وما تزوّج تسعا كي يلذّ بها إذن لما اختار من يحبون للهرم
لكنه كان يرجو أن يتم به نشر الهداية في الأقوام باللدم[۱۱]

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو شادیاں لذّت حاصل کرنے کے لئے نہیں کئے اگر ایسا ہوتا تو وہ بوڑھی عورتوں سے شادی نہ کرتے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس کے ذریعے اسلام تمام قوموں میں پھیل جائے)

---

[۹] علي أحمد باكثير، ديوان أزهار الربى في شعر الصبا: تحقيق: محمد أبو بكر حميد، الدار اليمنية للنشر، بيروت، ۱۹۸۷، ص ۱۹۵

[۱۰] أحمد عبد الله السومحي: علي أحمد باكثير حياته وشعره الوطني والاسلامي، نادي الأدبي الثقافي، جدة، ۱۹۸۲، ص:۵۸

[۱۱] علي أحمد باكثير، ديوان أزهار الربى في شعر الصبا، ص ۲۰۰

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم روم کے قیصر یا فارس کے کسریٰ کی طرح کوئی بادشاہ نہیں تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی تھے جو پوری دنیا کے لیے ایک عظیم پیغام لے کر آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل وعیال اور صحابہ کے ساتھ ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کام خود کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی نوکر چاکر نہیں رکھا:

یکون في صحبه فردا کأصغرهم شأنا ویمشی بلا صحب ولا حشم
ویخصف النعل، یرفو الثوب، یأخذ في إعانة الأهل، یسعی في سرورهم
لا تعجبوا.. إنّ(طه) لم یکن ملکا بل مرسل جاء بالآیات والحکم[۱۲]

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں سب سے چھوٹے کی طرح رہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی حفاظت اور بغیر کسی بھیڑ کے چلتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود جوتے کی مرمت کرتے تھے، اپنے کپڑے خود رفو کر لیتے تھے، گھر والوں کی مدد کرتے تھے اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعجب نہ کرو: کہ طٰہٰ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بادشاہ نہیں تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے ایک رسول تھے جو آیات اور احکام لے کر آئے تھے)

اسی طرح شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی رسالت کی تعریف میں یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ۱۰۰ سے ۱۲۵ اشعار میں اس جاہلی دور کی تصویر کشی کی ہے جو کہ نبوت سے پہلے کا دور تھا۔ اس دور میں لوگ بہت زیادہ بے راہ روی اور فساد میں مبتلا تھے۔ لوگ بغیر کسی قانون یا مذہب کے زندگی گزار رہے تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ طاقتور لوگ کمزوروں کو لوٹتے اور ان کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو صحیح راستے کی طرف لائیں اور انہیں گمراہی سے بچائیں:

فکان من حکمة المولی ابتعاث فتی یهدی شعوب الوری للمنهج اللقم
أمیّة ما حوت علما سوی لغة شمّاء، ما خضعت للطرس والقلم[۱۳]

---

[۱۲] علي أحمد باکثیر: نظام البردة، ص:۲۱

[۱۳] ماخذ سابق، ص: ۲۳

(اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی تھی کہ انہوں نے ایک ایسے نوجوان کو نبی بنایا جو پڑھا لکھا نہیں تھا اور جس نے اپنی زبان سے لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا۔ ان کی قوم ان پڑھ تھی اور سوائے عربی زبان کے اسے کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ خود دار تھی لیکن اسے کاغذ و قلم سے واسطہ نہ تھا)

علی احمد باکثیر نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو اپنے کلام میں اس طرح سجایا ہے جیسے احمد شوقی نے کیا تھا۔ انہوں نے قرآن کے علاوہ دیگر معجزات مثلاً معراج کے عظیم واقعے اور انگلی سے پانی کے نکلنے جیسے کرشمات کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم ایک ایسا عظیم معجزہ ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا اور یہ عظیم معجزہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سب سے پختہ ثبوت ہے۔ قرآن کریم انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور اسے ہر طرح کی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن کریم کو ایک ایسے آدمی پر نازل کیا گیا ہے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم منزل من اللہ کتاب ہے۔ باکثیر نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے جسے واقعہ افک کہتے ہیں۔ اس واقعہ میں ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگایا گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان تھے۔ لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کو پاک قرار دیا۔ قرآن کے ہی ذریعے آپ کو تسلی ملی کہ یہ واقعہ صریح بہتان ہے۔ واقعہ افک اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

خلاصہ: علی احمد باکثیر کا یہ قصیدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک پر جوش اور عقیدت مند خراج تحسین ہے۔ شاعر نے اپنے دل کی گہرائیوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کو بیان کیا ہے۔ اس قصیدے کا مقصد صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو ان کی سنتوں پر عمل کرنے کی تلقین بھی ہے۔ شاعر نے سادہ اور عام فہم زبان میں گہرے مفہوم کو بیان کر کے مسلمانوں کے دلوں کو چھو لیا ہے۔ یہ قصیدہ صرف ایک ادبی اثر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک روحانی غذا بھی ہے۔ آج بھی جب ہم اس قصیدے کو پڑھتے ہیں تو ہمارے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے محبت و عقیدت اور بڑھ جاتی ہے۔

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، برطانوی بہی خواہوں کے کرتوت (محاذ یوپی ۱۸۵۷ کے تناظر میں)، ڈیلبرٹ انٹرپرائزز، میرٹھ (۲۰۲۵)، صفحات: ۴۴۸ (مجلد)، قیمت: ۴۰۰روپے۔ ایمیل: shahid.alig44@gmail.com

سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بہت سے اسباب تھے جن میں انقلابی طاقتوں کا انتشار، اعلیٰ اور مرکزی قیادت کا فقدان، مناسب فنڈ کے فراہم نہ ہونے کی وجہ سے انقلابی فوجوں میں بددلی شامل ہیں۔ لیکن اس کا ایک بنیادی سبب اندرونی خیانت بھی تھی۔ لال قلعہ کے اندر اور باہر ایسے عناصر موجود تھے جو انگریزوں کے خیر خواہ تھے اور ان کو انقلابیوں کے پلان اور کمزوریوں کے بارے میں باخبر کرتے رہتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے بہت سے راجاؤں اور نوابوں نے بھی انگریزوں کی مدد کی۔ موجودہ کتاب یونائٹڈ پراونسز (صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ)، جو آزادی کے بعد "اترپردیش" سے موسوم ہوا، کے اندر ایسے غدار عناصر کا ضلع بضلع تتبع کیا گیا ہے۔

کتاب میں مندرجہ ذیل اضلاع میں تحریک انقلاب اور غداروں کی سرگرمیوں کے بارے میں الگ الگ ابواب کے تحت معلومات فراہم کی گئی ہیں: میرٹھ ڈویژن: میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور، بلند شہر؛ آگرہ ڈویژن: علی گڑھ، متھرا، مین پوری، اٹاوہ، ایٹہ، فرخ آباد؛ بریلی ڈویژن: بریلی، شاہجہاں پور، مرادآباد، رامپور، بجنور، بدایوں؛ الہ آباد ڈویژن: الہ آباد، فتحپور، کانپور، باندہ، ہمیرپور؛ بنارس ڈویژن: بنارس، مرزاپور، جونپور، غازیپور، گورکھپور، اعظم گڑھ؛ لکھنؤ ڈویژن: لکھنؤ، سیتاپور، سلطانپور، فیض آباد، گونڈہ اور بہرائچ۔

اب بھی اس عظیم تحریک آزادی کا ٹھیک سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور انگلینڈ کی لائبریریوں جیسے برٹش لائبریری لندن اور نیشنل آرکائیوز دہلی کے ذخائر میں اب بھی ایک لاکھ کے قریب دستاویزات اور نوشتے موجود ہیں جن کی اشاعت یا جن کو استعمال کرکے تحریک انقلاب کی حقیقی تاریخ مرتب کرنے کا کام باقی ہے۔ آزادی کے بعد جو لوگ حاکم ہوئے، ان کو اس تحریک سے بہت دلچسپی نہیں تھی کیونکہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ بڑی حد تک مسلمانوں کی قیادت میں لڑی

گئی تھی اور مسلمانوں نے ہی اس کے بعد انگریزوں کے غیض و غضب کا برسوں مقابلہ کیا۔ ہزاروں سرکردہ لوگ پھانسی، کالاپانی اور جائدادوں سے محرومی سے سرفراز ہوئے لیکن قوم نے ان کو بھلا دیا۔ موجودہ کتاب میں بہت سے مجاہدین کے کارناموں کے ذکر کے ساتھ غداروں کے کرتوتوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ انقلاب کی ناکامی کے بعد ان غداروں کو انگریزوں نے کس طرح نوازا، عہدے، تمغے اور جائدادیں دیں۔

علی گڑھ کے اسکالر ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی نے جدوجہد آزادی کے مختلف واقعات اور ہیروؤں کے بارے میں گہری تحقیق و جستجو کر کے وقیع کتابیں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ اب تک انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھی ہیں: جنگ آزادی کے سرخیل، ۲۰۱۳ء، صفحات: ۲۷۲؛ غداروں کی کارستانیاں، ۲۰۲۰ء، صفحات: ۳۳۶؛ گم نام مجاہد آزادی: شیر علی خاں آفریدی، ۲۰۲۱ء، صفحات: ۱۲۸ اور جاں نثارانِ وطن، ۲۰۲۳ء، صفحات: ۲۵۶۔

موجودہ کتاب اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر شمس الاسلام کی کتاب "۱۸۵۷ کی ان کہی حیرت انگیز داستانیں" (ہندی: فاروس میڈیا ۲۰۲۳؛ اردو ایڈیشن اسی نام سے: انجمن ترقی اردو ۲۰۲۴)، سلیم قریشی و سید عاشور کاظمی کی "۱۸۵۷ کے غداروں کے خطوط" انجمن ترقی اردو ہند۔ ۲۰۱۱؛ (Shamsul Islam, Letters of Spies – how British captured Delhi in 1857) شمس الاسلام، جاسوسوں کے خطوط: انگریزوں نے دلی پر ۱۸۵۷ میں کیسے قبضہ کیا (انگریزی: فاروس ۲۰۲۲) وغیرہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ جو قومیں تاریخ سے سبق نہیں سیکھتی ہیں وہ اپنی غلطیوں کو بار بار دہراتی ہیں۔ مسلمانان ہند کا یہ المیہ ہے کہ وہ اپنی ماضی کی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھتے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے ہمارے باشعور لوگ ضرور سبق لیں گے۔ (ظفر الاسلام خاں)

ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، غالب اعظم شعراء الھند: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۱۴۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، سال اشاعت ۲۰۲۵ء، پتہ: فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیوٹ لمیٹیڈ ڈی-۸۴، ابوالفضل انکلیو-۱، جامعہ نگر، نئ دہلی-۲۵، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۱۲۰۶۶۹

غالب، سخن فہموں کی نظر میں تنہا تھے جن کے لطف گویائی کی ہم سری کسی اور کے لیے ممکن ہی نہیں رہی۔ تخیل اور فکر کامل میں بقول اقبال: اگر کوئی غالب کا ہم سر و ہم نوا ہوا تو وہ جرمنی کا

گوئٹے ہی تھا۔ لیکن عجب بات ہے کہ گوئٹے سے عالمی زبانوں نے خاص اعتنا کیا۔ غالب فارسی اور بعد میں کسی حد تک ہندی، انگریزی، روسی ادب شناسوں کے لیے غیر متعارف نہیں رہے۔ مگر اسد اللہ خاں، عربی ادب کے اسد الغابہ میں شامل ہونے سے محروم ہی رہے۔

اسی محرومی کا احساس عرب وہند کے ان اصحاب قلم کو بھی ہوا جن کو دونوں زبانوں کی ادب شناسی کا حق حاصل تھا۔ غالباً اسی احساس کے پیش نظر مجمل لیکن بڑی حد تک ایک کامل مرقع کا تحفہ عرب اور عربی والوں کے لیے اس کتاب کے فاضل مصنف نے اس وقت پیش کرنا چاہا جب غالب صدی کی تقریبات نے ہندوپاک میں ایک غلغلہ پیدا کر رکھا تھا۔ یونیسکو نے بھی متاثر ہو کر ان تقریبات کو عالمی شکل دینے کی کوشش کی تھی، روسی اور انگریزی زبانوں میں اس وقت غالب کے تعارف کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ غالب کے چند اشعار کے ترجمے کے سوا، عربی میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں تھا جو شاید پوچھتے رہے ہوں کہ غالب کون ہے؟ اس سوال کے جواب میں فاضل مصنف نے جو اسوقت قاہرہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے یہی کہا ہو گا کہ:

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اسی احساس سے انھوں نے بعض اشعار کا ترجمہ نامور عربی ادیب پروفیسر یحییٰ حقی کے سامنے پیش کیا جس کو انھوں نے پسندیدگی کے اظہار میں مجلہ المجلہ میں شایع کر دیا۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ یحییٰ حقی نے پھر ایک اور مضمون لکھوایا۔ اس طرح قریب پچاس سال پہلے کچھ یادداشتیں تیار ہو گئیں۔ مصر کے زمانۂ قیام میں یہ چھپیں اور شایع ہوئیں۔ مگر کتابی شکل ان کو اب حاصل ہوئی اور اس طرح کہ چار فصلوں میں غالب کی زندگی، شخصیت، تالیفات اور پھر کلام کے مختلف مدارج کے ساتھ کلام غالب کے امتیازی پہلوؤں کو عنوانوں اور پھر ان کے ذیل میں اشعار کے ذریعہ پیش کر دیا گیا۔ اور اس سلیقے سے کہ المیہ، طربیہ، مزاحیہ اور رجزیہ اشعار۔ غزل، فلسفہ، حکمت اور تصوف کا نمائندہ کلام، یا تعقید، رمز، ایجاز جیسے صنائع و بدائع پر مشتمل اشعار الگ الگ عنوانوں سے منتخب صورت میں سامنے آ گئے۔ مثلاً تصوف میں یہ شعر لیا گیا کہ:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

(لاتخدعنک الحیاۃ، یا اسداللہ، العالم لیس الا حلقۃ من شبکۃ الخیال)۔

اس کے ضمن میں شیخ علی حزیں اور علامہ شبلی کے بعض اقوال کے ساتھ بتایا گیا کہ فلسفۂ تصوف کو غالب نے اہمیت دی تو بڑی وجہ ان کا مرزا عبد القادر بیدل سے متاثر ہونا تھا۔ ضمناً وحدۃ الوجود کا بھی ذکر آگیا اور پھر متعدد اشعار کے ترجموں سے گویا غالب اور ان کے مسائل تصوف کی جامع ترجمانی آگئی۔

شروع میں علامہ اقبال کی نظم مرزا غالب کا ترجمہ دیا گیا:

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا

ہے پرِ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

حاشیہ میں بتایا گیا کہ اس نظم کے اصل حسن کو کسی اور زبان میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔ ایک غالب شناس نے لکھا کہ غالبؔ نے عربی میں صرف و نحو کے سوا، کسی استاد سے کچھ اور نہیں پڑھا تھا، مگر ان کے کلام کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ عربی سے ناواقف تھے۔ بقول صاحب گل رعنا، غالب نے عربی الفاظ کو ہر جگہ اسی سلیقے سے استعمال کیا جس طرح ایک اچھے عربی فاضل سے اس کی توقع ہوسکتی ہے۔ غالب پر عربی زبان میں اس اولین مطالعہ و تجزیہ نے گو مختصر ہی سہی ایک قرض ہی ادا نہیں کیا، عربی ذوق و ذہن کی تسکین کا خوشگوار فریضہ بھی ادا کردیا۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، نسخۂ کیمیا: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۴۰۷، قیمت: ۱۲۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۱ء، پتہ: مکتبہ دینی تعلیمی کونسل، عارف آشیانہ، چوک، لکھنؤ-۳، اور لکھنؤ کے دوسرے مشہور مکتبے اور عارف علی انصاری بک سیلرز، لطیف مارکیٹ، خیر آباد، سیتا پور، یوپی، موبائل: ۹۸۳۹۵۸۲۲۱۱

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے ٹوٹے اور بکھرے اور ہمہ داغ داغ وجود کو جو سب سے کاری اور سرکاری جراحت پہنچائی گئی وہ ان کی دینی تعلیم کو برباد کرنے کی تھی۔ دینی تعلیم کے علاوہ سرکاری اسکولوں کے نصاب تعلیم میں تاریخی سچائیوں اور غیر جانبدار مذہبی و اخلاقی بیانیوں کو مسخ کرنے کی دانستہ کوششوں نے ملت کے فکر مند اور درد مند دلوں کو اس طرح بے چین کیا کہ دینی تعلیم اور نصابی اصلاح کو انہوں نے ملت کے لیے فرض عین قرار دیا کہ اگر اس سے غفلت کی گئی تو ہندوستانی مسلمانوں کا بہ حیثیت امت مسلمہ باقی رہنا مشکل ہو گا۔

ملک کی آزادی کے معاً بعد گرچہ آئین کی شکل میں اکثریتی پندار اور ممکنہ جبر و اختیار سے ایک

تحفظاتی ضمانت کی سہولت دی گئی تھی، لیکن یہ عملاً اکثریتی فرقے کی مرضی و مصلحت ہی کی پابند تھی۔ جس کا سب سے بڑا اور تکلیف دہ اظہار مکاتب و مدارس سے شعوری طور پر دینیات اور اردو زبان کا اخراج تھا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک، نصابی کتابوں میں تاریخی حقائق کی جگہ دیومالائی کہانیوں کی شمولیت تھی۔ یہ خطرناکی پوری قوم کے لیے تھی مگر مسلم اقلیت کے لیے تو گویا یہ اپنی تہذیب، زبان اور سب سے بڑھ کر مذہب سے انحراف وارتداد جیسی جان لیوا بیماریوں کے وبائی جراثیم کا عام ہونا تھا۔ یوپی جیسے اہم صوبے کو خاص طور پر اس وبا کا نشانہ بنایا گیا۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے اور اپنے بچوں کی ذہنی و فکری حفاظت کے لیے دینی تعلیمی کونسل کے نام سے اللہ کے چند بندوں نے ایک تحریک بپا کی۔ ۱۹۵۹ء میں جب اس کی تشکیل ہوئی تو شاید ہی کسی کے ذہن میں آیا ہوگا کہ اس تحریک کی وجہ سے چھوٹے بڑے مدارس کی بڑھتی ویرانیاں، چند برسوں ہی میں صرف دور ہی نہیں ہوں گی بلکہ دینی مدارس کی آبادی اور آبادکاری، کونسل کی فتح مبین کی بشارت میں بدل جائے گی۔ اب نصف صدی سے زیادہ کی مدت ہو چکی ہے۔ اگرچہ آج بھی دینی تعلیمی کونسل کی معنویت اور افادیت بے معنی اور بے اثر نہیں کہی جاسکتی۔ مگر یہ بھی سچائی ہے کہ قاضی عدیل عباسی، مولانا محمود الحسن عثمانی، مولانا منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جیسوں کے دور راشدہ کی برکتوں کا اب ظہور نہیں۔ لیکن شروع کے دس پندرہ برسوں کی فکر اور محنت آج بھی اس تحریک کی روح کو زندگی کا پیغام دیتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں اسی روح کو حد درجہ تحقیق و ترتیب سے پیش کیا گیا ہے یعنی کونسل کی تمام کانفرنسوں کے صدارتی، استقبالی اور کلیدی خطبات کو سنہ وار ۱۹۵۹ء سے ۲۰۱۷ء تک یکجا کر دیا گیا۔ پہلا خطبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تھا، اس سلسلہ خطبات میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر فریدی، مولانا محمد تقی امینی، مولانا شاہد فاخری، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا ہاشم فرنگی محلی، ظفر احمد صدیقی ایڈوکیٹ، مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، مولانا عبداللہ عباس ندوی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ظفر احمد صدیقی، ریاض الدین جیسے انتہائی مخلص کارگزاروں کے خطبے بھی ہیں۔ مولانا سید محمد رابع ندوی اور سید حامد کے تو کئی کئی خطبات ہیں۔ یہ سارے خطبات محض رسمی یا وقتی یا یک موضوعی نہیں کہے جاسکتے۔ یہ علم و حکمت، تعلیم و تدریس اور قوم و ملت کے مسائل وخصائل کے تعلق سے ایسا خزانہ ہیں جن کی دولت و ثروت سے ہمیشہ

فیض و فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ان خطبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی تعلیمی تحریک، محض ایک ردعمل نہیں تھی۔ اس کے سامنے یہ پہلو بھی تھا کہ اگر حکومت، نصاب کی اصلاح کرنے اور حقیقی معنوں میں اس کو سیکولر بنانے پر نیک نیتی سے راضی بھی ہو جائے تو بھی آئندہ نسلوں کو اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے ملت کو اپنے تعلیمی نظام کی تعمیر و ترقی کی فکر کرنی ہی ہوگی۔ تعمیری یا احتجاجی دونوں اعتبار سے سنجیدہ اور مسلسل فکر و محنت ضروری ہے۔ نہایت بیش قیمت علمی و عملی تجربات و مشاہدات کی وجہ سے یہ تمام خطبات حقیقتاً نسخۂ کیمیا کی تاثیر رکھنے والے ہیں۔

قریب ساٹھ سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً پیش کیے گئے ان خطبات سے صرف دینی تعلیمی کونسل کی زندگی ہی نہیں، امت کی نبض اور رفتارِ حیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نکلے تھے کہاں جانے کے لیے، پہنچے ہیں کہاں، معلوم نہیں۔

سید حامد نے دینی تعلیمی کونسل کے سابقین اولین کے ذکر میں خوب کہا کہ فی زمانہ انسان کے کام کرنے کے محرکات چار ہیں: زر، اعتراف، اشتہار اور اقتدار۔ ان بزرگوں کی ان چاروں چیزوں کی خواہش تھی نہ اعتراف کی جستجو، نہ شہرت کی طلب نہ اقتدار کی ہوس۔ پھر بھی غیر معمولی کامیابی ملی تو اس لیے کہ یہ ضرورت کے سوتوں اور ایمان کے سرچشموں سے پھوٹی تھی۔

سید حامد کے ایک اور خطبہ میں یہ شکایت بھی غور کی دعوت دیتی ہے کہ مسلمانوں نے جمہوریت کی پذیرائی دانش و بینش کے ساتھ نہیں کی۔ قوم کا شعار کوتاہ دستی اور کوتاہ اندیشی کا زیادہ رہا۔ ایک اور جگہ لکھا کہ علم سے مراد صرف دنیاوی علم نہیں، دینی علم بھی ہے۔ اس جملہ کو یوں بھی پڑھا جاسکتا ہے کہ علم سے مراد دینی علم ہی نہیں، دنیاوی علم بھی ہے۔ سید حامد سے بہت پہلے مولانا علی میاں ندوی نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں کہا تھا کہ اس ملک کا ضمیر زندہ اور بیدار رہے۔ لیکن ابھی تک معاملات کی سنگینی ذہن نشین نہیں ہوسکی۔ ایک مسلمان کے نزدیک اس کے عقائد اور اس کا مسلک زندگی، اس کے جسم و جاں اور اس کی عزت و ناموس سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ اصلاً یہ فکر و عقیدہ ہی ملت کے لیے نسخہ کیمیا ہے۔ صرف ایک تحریک کے حوالے ہی سے اس کتاب کو دیکھنا گویا نظر اور دوریٔ نظر کو محدود کرنا ہے۔ اسی لیے قومی اداروں اور جماعتوں کے ذمہ داروں کے لیے یہ کتاب خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔

فاضل مرتب ومؤلف کی علمی وادبی خوبیوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اس کتاب میں تلاش وجستجو، جمع واخذ اور تدوین وتعلیق کی راہ میں دیدہ ریزی اور جاں کاہی کا اعتراف اور بھی ضروری ہے کہ اس میں تن تنہا ہونے کی کسک بھی شامل ہے۔ (ع۔ ص)

شاہد عمادی، اسلامی عہد زریں کے مشاہیر سائنس داں: صفحات: ۲۷۲، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۳۱۳۱۲۷۸

زیر نظر کتاب مصنّف کے والد مولانا ابراہیم عمادی مرحوم کی کتاب "مسلمان سائنسداں" کا غیر مرتب مسوّدہ تھا جس میں تقریباً ۴۰ سائنس دانوں کے حالات چالیس سال قبل تحریر کیے گئے تھے۔ مصنّف نے اس میں تقریباً اتنا ہی اضافہ کیا اور کل ۸۱ سائنس دانوں کے حالات، اس عہد کے سیاسی، تمدنی اور تاریخی واقعات مختصراً تحریر کیے اور آسان اسلوب میں ایک اچھی کتاب تیار کر دی۔ جن لوگوں نے شبلی کے علمی مقالات اور مولانا عبد السلام ندوی کی حکمائے اسلام وغیرہ کو پڑھا ہے ان کو اس میں قند مکرّر کی لذت محسوس ہو گی لیکن جو ناواقف ہیں ان کے لیے یہ کسی علمی تحفے سے کم نہیں۔

اس میں کل تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں قدیم یونانی فلاسفہ تالیس (طالیس)، فیثاغورث، بقراط، ارسطو اور جالینوس وغیرہ اور دوسرے باب میں مشہور حکمائے اسلام کے متعلق مختصر مگر جامع معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں مختلف علوم یعنی طب، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کے ارتقائی سفر کے جائزے کے ساتھ تقریباً ۲۴ مشہور مسلمان سائنس دانوں مثلاً جابر بن حیان، محمد بن موسی، ابو بکر زکریا رازی، ابن الہیثم، البیرونی، بو علی سینا وغیرہ کی تصنیفات کے یورپین زبانوں میں ترجمے کی ایک فہرست دی گئی ہے جس میں مترجم، زبان، مقام وسنہ اشاعت وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ یہ اس کتاب کا مختصر مگر اہم باب ہے۔

اکثر مضامین اخبار "آگ" لکھنؤ میں چھپ چکے ہیں۔ کتاب کے مختصر ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اسلامی شہروں پر ہلاکو اور چنگیز خاں کا جو قہر ٹوٹا اور اس تباہی کے بعد جو نسل آئی وہ سائنسی علوم سے بیزار، گل وبلبل اور میناو ساغر میں دل بہلاتی رہی اور آج بھی ہم علم کی دولت اور اللہ کی نعمتوں سے بے نیاز ہیں۔ ٹی وی اور موبائل نے ہماری قابل رشک تہذیب کو سمیٹ کر ایک نئی تہذیب کو جنم دیا ہے کہ کسی کو کتاب یا اخبار پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ پروف کی طرف مزید

توجہ کی ضرورت تھی۔ مراکش کی جگہ مراقش اور کتاب الجبر و المقابلہ کی جگہ و مقابلہ، کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف کی جگہ عن التاسیف اور ضخیم کی جگہ زخیم لکھ گیا ہے۔ حوالہ دینے کے متروک وغیر مستند طریقے کی پیروی کی گئی ہے۔ ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود امید ہے کتاب کو حسن قبول حاصل ہو گا۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ابو صادق علی عاشق علی اثری، علامہ عبد الحمید رحمانیؒ: صفحات ۳۷۶، الدار الاثریہ، اثری منزل ۱۰۷، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں۔ موبائل نمبر: ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

مولانا عبد الحمید رحمانی کا آبائی وطن ضلع سدھارتھ نگر تھا۔ ان کی تعلیم جامعہ رحمانیہ، بنارس اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ہوئی۔ جامعہ سلفیہ میں تدریس کی خدمت کچھ سالوں انجام دی۔ ۱۹۷۲ء میں دہلی آئے۔ یہاں انہوں نے متعدد دینی ادارے اور تنظیمیں قائم کیں جن کا فیض ہنوز جاری ہے۔ متعدد اردو اور عربی رسائل و جرائد کے مدیر رہے۔ ان کے اندر قوت عمل کے ساتھ ساتھ نظم وضبط کی بھی اچھی صلاحیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے احیاء نو کی ذمہ داری جب بڑے بڑے علمائے اہل حدیث کی موجودگی میں ان کے سپرد کی گئی تو انہوں نے اس میں جان ڈال دی۔ مولانا عبد المجید اصلاحی جیراج پوری مرحوم کا طویل خط اس کا گواہ ہے (ص ۱۲۴ تا ۱۲۸) لیکن جمعیۃ کے دفتر پر حملہ ان کے دور کا افسوس ناک واقعہ ہے۔ ملکی، قومی، ملی اور سیاسی امور و مسائل میں وہ اپنی الگ رائے رکھتے تھے۔ موقع بہ موقع اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اسلامک اویکنگ سنٹر اور جامعہ اسلامیہ سنابل، نئی دہلی ان کے عظیم الشان کارناموں میں شامل ہے۔

زیر نظر تصنیف کل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں نام ونسب، خاندان پیدائش ووفات، دوسرے میں تعلیمی حالات، تیسرے میں اعتقادی غیرت اور بین مسلکی وسیاسی فکر پر گفتگو کی گئی ہے اور لکھا گیا ہے کہ عقیدہ وفکر اور منہج ومسلک کی بابت کسی ابہام اور مداہنت کے قائل نہیں تھے (ص ۶۳)۔ اسی باب میں ان کے سیاسی فکر وشعور کو پختہ بتایا گیا ہے۔ ایمرجنسی کے دوران انہوں نے اندرا گاندھی کے خلاف بہوگنا کی حمایت کی تھی (ص ۶۵)۔ چوتھا باب سب سے مفصل ہے۔ اس میں تدریس، صحافت، تصنیف و تالیف، خطابت، علمی، دینی اور سماجی تنظیموں کی رکنیت، سیاست اور ملی وسماجی خدمات سے متعلق ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل ہے۔ پانچویں میں ان

مشکلات اور آزمائشوں کا ذکر ہے جو انہیں اس راہ میں پیش آئیں۔ چھٹے میں ان کے اخلاقی اوصاف، توکل، شورائیت پسندی، حق گوئی، بے نیازی، ایثار اور زہد و استغنا کے واقعات بتائے ہیں۔ ساتویں میں ہم عصر علما کے ان کے متعلق خیالات اور آٹھویں میں ان پر بیس منظوم گلدستے شامل ہیں۔

مولانا کے جرأت مندانہ واقعات کے ضمن میں فخریہ لکھا گیا ہے کہ قاری طیب صاحب نے جامعہ سلفیہ میں خطاب کے دوران اختلاف أمتي رحمة موضوع حدیث سنائی۔ مولانا نے برسر مجلس قاری صاحب کو متنبہ کیا اور اس قول کی تصحیح کی تو قاری صاحب نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ پہلی مرتبہ مجھے علم ہوا کہ یہ حدیث موضوع ہے (ص ۹۸) حالانکہ مولانا رحمانی صاحب کے یہاں اس قسم کی چیزیں خود موجود ہیں۔ اپنے دور کے مسلمانوں کی داخلی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لایبقی من الإسلام إلا اسمه حدیث نقل کی ہے (ص ۱۵۵) جبکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث خود موضوع ہے اور صحیح نہیں ہے۔

کتاب اس سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ یہ اس کا تصحیح و اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ عام اہل علم بالخصوص مسلک اہل حدیث کے علم برداروں کے لیے یہ کتاب فائدے سے خالی نہیں۔ (ک۔ ص اصلاحی)

مولانا محمد عارف عمری، الحاج گلزار احمد اعظمی: نقوش و تاثرات: صفحات: ۱۴۴، آفس جمعیۃ العلماء مہاراشٹر، امام باڑہ کمپاؤنڈ، نزد مغل مسجد، ممبئی ۹، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۸۷۳۶۲۹۴۶

بعض شخصیتوں کی تعلیم و تربیت میں ظاہری رسوم و قیود کا بہت دخل نہیں ہوتا لیکن ان کے علم و عمل کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ ان کی باضابطہ تعلیم و تربیت نہیں ہوئی ہے۔ گلزار اعظمی صاحب کا شمار ایسے ہی ممتاز افراد میں ہوتا ہے۔ انہوں نے طویل عمر پائی اور عمر کا اچھا خاصا حصہ قومی و ملی کاموں میں صرف کیا۔ ان کا سب سے عظیم الشان کام جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کے پلیٹ فارم سے دہشت گردی کے الزام میں بے گناہ مسلم نوجوانوں کی قانونی امداد رسی ہے۔ اس سے یقیناً مسلمانوں کے اندر حوصلہ پیدا ہوا اور اندھیرے میں انہیں روشنی کی کرن نظر آئی۔ زیر نظر مجموعۂ مقالات میں جمعیۃ کے اس شیر دل سپاہی کے حقائق و واقعات زندگی کا ملک کے ممتاز اہل علم اور دانشوروں کے قلم سے احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اہم علمی و ادبی ہستیوں اور دانشوروں کے تعزیت نامے اور مرثیے بھی ہیں۔

کتاب میں شامل مضامین کی نوعیت تاثراتی ہے۔ یعنی آنکھوں دیکھا حال لکھا گیا ہے۔ کسی نے ان کی بے لوث خدمات کا تعارف کرایا، کسی نے ان کے عزم و حوصلے کا ذکر کیا، کسی نے ان کی یادوں کے دیے روشن کیے۔ کسی نے ان کو حسن اخلاق کا پیکر بتایا، کسی کی نظر میں وہ محسن اور مسیحا تھے۔ کسی نے جمعیۃ العلماء سے ان کے رشتے پر گفتگو کی، کسی نے ان کو بے باک ملی رہنما اور کسی نے ہمت و شجاعت کے پہاڑ کی حیثیت دی۔ کسی نے ان میں مخلص اور انسان دوست شخصیت کے عناصر تلاش کیے۔ بہر حال بیش تر مقالات میں "اذکروا محاسن موتاکم" کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مرتب دارالمصنّفین کے سابق رفیق اور معروف اہل قلم ہیں۔ ان کا مقالہ جامعیت اور متعدد انکشافات کا حامل ہے۔ مثلاً گلزار صاحب کے متعلق یہ بات جمعیۃ العلماء کے باہر لوگوں کو کم ہی معلوم ہے کہ مرکزی قیادت سے شدید اختلاف کے باوجود وہ باغیانہ تیور کے ساتھ جمعیۃ میں رہے۔ اس سے مرکزی قیادت کا تحمل بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کتاب کی دستاویزی حیثیت اور افادیت مسلم ہے۔ (ک۔ص اصلاحی)

فتاویٰ دارالعلوم مئو (مکمل و مدلل) جلد اول و دوم: ترتیب و تخریج و تعلیق: مفتی ریحان مبشّر قاسمی مئوی استاذ دارالعلوم مئو، شعبۂ نشر و اشاعت مدرسہ دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن۔ یوپی ۲۰۱۹ء، ۲۰۲۱ء، کل صفحات: جلد اول ۴۸۰، جلد دوم ۵۰۷، ایمیل: maudarululooom@gmail.com

مدرسہ دارالعلوم مئو ضلع مئو کا ایک قدیم معروف ادارہ ہے۔ یہاں سے سیکڑوں علماء و فضلاء پیدا ہوئے، ان میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اور مفتی عبد الباریؒ نمایاں اور ممتاز ہوئے۔ اس مدرسے میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے اور شعبۂ افتاء بھی قائم ہے۔ شروع ہی سے دارالعلوم مئو نے فقہ و فتاویٰ میں اولیت حاصل کی۔ یہاں سے مسلمانوں کی زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ مسائل کے تسلی بخش جواب دیے جاتے رہے ہیں۔ اور یہ کام یہاں کے جید علمائے کرام اور مفتیان کے سپرد ہے۔

ان فتاویٰ کی دونوں جلدوں میں جن مشاہیر کے فتاویٰ ہیں، ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں: مفتی سید میرک شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد صابر مئویؒ، مولانا محمد مسلم جونپوریؒ، مفتی محمد سلیم کوپاگنجیؒ، مفتی اسلام الحق کوپاگنجیؒ، مفتی نظام الدینؒ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مفتی شیخ محمد مئویؒ استاذ محترم مولانا عبد الحق اعظمیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور مفتی انور علی جو موجودہ صدر مدرس اور مفتی ہیں۔

جلد اول میں پہلے چند ممتاز علماء کی تقریظیں و تائثرات دیے گئے ہیں۔ ان میں مفتی ابوالقاسم نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند شامل ہیں۔ پھر مذکورہ صاحب فتاویٰ مفتیان و علماء کے مختصر احوال پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد الایمان والعقائد، ما یتعلق بالفأل والطیرۃ، باب الفاظ الکفر، مایتعلق بالاسلام وشرائعہ، ما یتعلق بالقرآن الحکیم، مایتعلق بالنبیّ واصحابہ، مایتعلق بالصلاۃ والذکر وغیرھا، مایتعلق بالعلم والعلماء، مایتعلق بالردّۃ وعدمھا، باب الفلکیات، باب السیاسیات، باب المسح علی الخفین وغیرہ ابواب شامل ہیں۔ اس کی جلد دوم کے ابواب یہ ہیں: کتاب الصلاۃ، باب الأذان، باب الاقامۃ، باب صفۃ الصلاۃ، باب الجماعۃ، باب الامامۃ، باب مایفسد الصلاۃ ومالایفسد، باب مایکرہ فی الصلاۃ ومالایکرہ، باب القضاء للفوائت، باب صلاۃ الجمعۃ، اور باب العیدین وغیرہ۔

یہاں چند فتاویٰ بطور نمونہ دیے جارہے ہیں تاکہ اس سے ''فتاویٰ دارالعلوم مئو'' کی اہمیت سامنے آسکے۔ باب السیاسیات کے تحت ''ہندوستان دارالحرب یا دارالاسلام'' سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے: بنیادی طور پر دار کی دو قسمیں ہیں: (اول) دارالاسلام، (دوم) دارالکفر۔ پھر دارالکفر کی چار قسمیں ہیں: (ا) دارالمحاربۃ (ب) دارالمسالمۃ (ج) دارالأمن (د) دارالشرّ والفساد۔

ہندوستان کو دارالکفر کہنا صحیح ہے، دارالمحاربۃ یا دارالحرب نام دے کر سود کے جواز کا بہانہ تلاش کرنا غلط ہے، اس کی اجازت نہ انگریزی عہد میں تھی اور نہ آج ہے [۱] دارالحرب مان کر جو شخص سود کو جائز کہتا ہے، اس کو جمہوری اور سیکولر ملک میں ووٹ دینا، سرکاری ملازمت کرنا، ایم ایل اے اور ایم پی بننا، ہندوستان میں برابری کا مطالبہ کرنا، ان سارے حقوق سے دست بردار ہونا پڑے گا، اور بہت سارے مسائل بیس کروڑ مسلمانوں کے لیے پیدا ہو جائیں گے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ ہندوستان دارالکفر کی قسم دارالامن ہے [۲]۔

اس کتاب کے مرتب نوجوان فاضل مفتی ریحان مبشر قاسمی مئوی ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ یہ دونوں جلدیں اپنے اکابر مدرسہ کی سرپرستی میں مرتب کی ہیں۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

---

(۱) الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرۃ:۲۷۵)

(۲) فتاویٰ دارالعلوم مئو جلد اول، ص ۴۲۸-۴۲۹

غزل

وارثؔ ریاضی

کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن۔ بہار

نہ دل میں سکوں ہے، نہ لب پر ہنسی ہے
عجب حالتِ زار ہے ، بے بسی ہے

جنونِ وفا میں وہاں آ گیا میں
جہاں بے وفاؤں کی دنیا بسی ہے

سہمتا ہے حق بات کہنے سے انساں
جدھر دیکھتا ہوں، ادھر خامشی ہے

گرا دے گی دیوارِ انسانیت کو
وہ ظلم و تعصب کی آندھی چلی ہے

یہ حبِ وطن کا صلہ اللہ اللہ
مری ملکیت پر بڑی رہ زنی ہے

جو دل میں چھپی ہو، زباں پر نہ آئے
یہی تو سیاست کی بازی گری ہے

نہیں دائمی یہ غرورِ تحکم!!
کہ ہر سطوتِ خودسری عارضی ہے

روانی ہے ، تاثیر و شائستگی بھی
صداقت پہ مبنی، مری شاعری ہے

ابھی ہیں ادھورے بہت کام وارثؔ
مگر آخری موڑ پر زندگی ہے

رسید کتب موصولہ

معصوم مرادآبادی، چہرے پڑھا کرو: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، دریاگنج، نئی دہلی، صفحات: ۴۰۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۰۷۸۴۵۴۹

مولاناعبدالعظیم ندوی، مولاناابن الحسن قاسمی (ترتیب وتدوین) حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوریؒ: مصطفیٰ لائبریری، مہراج گنج، یوپی، صفحات: ۴۴۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۵۸۶۵۰۰۱

ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں، دستاویزاتِ مشاورت: فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۱۰۸۵، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۴۹۵روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۱۲۰۶۶۹

مولاناعبدالمعید قاسمی، ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتحپوری ایڈووکیٹ: حیات و افکار: عذرا بک ٹریڈرس، شاہین باغ، نئی دہلی، صفحات: ۸۰، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰روپے، موبائل نمبر: ۸۸۸۲۶۲۷۶۵۸

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، عبدالرزاق قریشی: احوال و آثار: پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۲۴۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

محمد کمال اختر قاسمی، عصر حاضر کی سماجی تبدیلیاں اور اسلام کی رہنمائی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی، صفحات: ۱۸۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۷۴۶۵۸۶

ابراہیم افسر، غالب اور میرٹھ (جلد اول): مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نزد جامع مسجد، اردوبازار، دہلی، صفحات: ۵۴۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۶۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۰۱۲۵۲۸

مولاناڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، مطالعہ امیر خسرو: بیت الحکمت، کریم الدین پور، گھوسی، مئو، صفحات: ۲۵۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۷۸۶۰۰۹۸۱۱۰

ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں، مشاورت ڈاکیومنٹس (انگریزی): فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۱۰۷۱، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۴۹۵ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۱۲۰۶۶۹

معصوم مرادآبادی، منشی عبدالقیوم خاں خطاط: قومی کونسل، برائے فروغ اردوزبان، نئی دہلی، صفحات: ۱۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۲۵روپے، فون نمبر: ۴۹۵۳۹۰۰۰

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

NOV 2025 Vol- 212(11) ISSN 0974-7346 Ma arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org